قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲، لاہور ۱۴

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر: عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲، لاہور ۱۴

جلد ۴۵ ——— مارچ ۱۹۹۲ء ——— شمارہ ۳

بدل اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: ۱۰/- روپے

فہرست مضامین

لمعات۔	ادارہ	۲
قرآن کا معاشی نظام۔	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۵
مال جمع کرنے والے متوجہ ہوں۔	ثریا عندلیب	۳۲
روزے کا مقصد۔	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۳۵
لمحۂ فکریہ۔	محمد عمر دراز	۳۸
وحی صرف قرآن میں ہے۔	اعزاز الدین احمد	۴۵
روزے کے احکام	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۵۱
درسِ قرآن	ادارہ	۵۶
حقائق و عبر	ادارہ	۵۹
بچوں کا صفحہ	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۶۰
Rise & fall of Nations.	ڈاکٹر سید عبدالودود	۸۰

ملعات

مسئلہ کشمیر

ماہِ فروری کا دوسرا عشرہ شروع ہوتے ہی حکومتِ پاکستان کو ابتلا و آزمائش کے پُل صراط سے گذرنا پڑا۔ ان دنوں کشمیر کو بھارت کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے کی تحریک نقطۂ عروج تک پہنچ گئی تھی اور تمام مقبوضہ کشمیر میں حریت پسند اپنی بقار اور آزادی کے لئے بھارتی فوجوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے تھے۔ پاکستان میں اس کا ردِ عمل فطری تھا۔ یہاں مقیم کشمیریوں نے مقبوضہ کشمیر میں اپنے بھائیوں کا ساتھ دینے اور تمام اقوامِ عالم کی توجہ بھارتی مظالم کی طرف مبذول کرانے کے لئے سر سے کفن باندھ کر کنٹرول لائن توڑنے اور عبور کر جانے کا عزم کر لیا۔ ہزاروں کشمیریوں کا جتھہ کنٹرول لائن کی طرف بڑھنے لگا۔ بھارت نے دھمکی دے دی کہ اگر کنٹرول لائن توڑی گئی تو پاکستان پر حملہ کر دیا جائے گا۔ بھارتی وزیراعظم نے یہاں تک کہہ دیا کہ پھر سندھ کو بھی بنگلہ دیش کی طرح علیحدہ ملک بنا دیا جائے گا۔

پاکستانی قوم اور حکومت کے لئے اس سے کٹھن مرحلہ کبھی نہیں آیا تھا۔ کشمیریوں کا جذبۂ آزادی جنوں کی حدوں کو چھو رہا تھا اور انہیں روکنے کا مطلب خود آزادیٔ کشمیر کی راہ میں رکاوٹ بننا تھا ـــــ نہ روکا جائے تو پاک بھارت جنگ یقینی تھی یا پھر ہزاروں نہتے مظاہرین کو بھارتی گولیوں کے سامنے خود دھکیل دینے والی بات تھی۔ حکومت کے نمائندوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ ہجوم کنٹرول لائن کی طرف نہ بڑھے اور جب ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں تو مجبوراً سینے پر پتھر رکھ کر اپنے ہی بھائیوں کو بزورِ منتشر کرنا پڑا جس سے مبینہ طور پر کئی افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ پاکستان کے وزیراعظم کو عالمی برادری سے کہنا پڑا کہ "آج تو ہم نے سرحد عبور کرنے والوں کو روک دیا ہے لیکن آزادی کی تحریک جس منزل تک پہنچ چکی ہے وہ مظالم کے پہاڑ توڑنے سے بھی نہیں دبائی جا سکتی۔" دوسری طرف کشمیری لیڈروں نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ ہر قیمت پر کنٹرول لائن توڑ کر رہیں گے۔ یہ صورتِ حال انتہائی نازک ہے اور کسی وقت بھی فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو سکتی ہے۔ بھارت طاقت کے گھمنڈ اور جنگی جنون میں مبتلا ہو کر پاکستان کے خلاف کوئی بھی اقدام کر سکتا ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ کوئی تیسرا ملک بھارت کی محبت میں علاقہ میں کسی خطرناک سازش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش

کرے۔ پیش آئندہ حالات کچھ بھی ہوں یہ بات طے ہے کہ اس وقت پورا جنوبی ایشیا جنگی تباہ کاریوں کی زد میں ہے اور عالمی طاقتیں خاموش تماشائی بنی ہوئی ہیں۔ اقوامِ متحدہ چشم پوشی سے کام لے رہی ہے اور پاکستان و بھارت کی مجموعی طاقت اور فوج کا بڑا حصّہ کنٹرول لائن کے دونوں طرف جمع ہے۔

نگہ بازگشت ڈالئے اور سوچئے کہ کشمیر کا تنازعہ کیسے پیدا ہوا اور کس طرح بڑھتے بڑھتے پاکستان اور بھارت کے درمیان تصادمات کا باعث بن گیا۔ ایک بار نہیں، ہزار بار سوچئے۔ ہر بار یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ اس کی علّت ایک طرف بھارت کی مکّاری ہے اور دوسری طرف پاکستان کی امن پسندی ـــــ پاکستان کو ایسا ہمسایہ ملا ہے کہ نہ اس کی دوستی پر اعتبار ہے نہ اس کی دشمنی میں مزہ۔ اس میں نہ خلوص ہے کہ کسی شریف کا دل موہ لے، نہ مردانگی کہ ایک بہادر سے دادِ تحسین لے سکے۔ اس ہمسائے کے مُنہ میں تو رام رام ہے لیکن بغل میں چھُری ہے۔ آزادی سے پہلے اس چھُری کا جو استعمال ہوا سو ہوا، لیکن آزادی کے بعد یہ چھری مسلمانوں پر ایسی بے دریغی سے چلتی رہی کہ اس کا بہایا ہوا دریائے خون آزاد ہمسایوں میں دائمی حدِ فاصل بن گیا۔

برِّصغیر میں آزادی کی پَو پھٹی تو غلامی کی شبِ تار سے دو آزاد ممالک نمودار ہوئے۔ برِّصغیر کا وہ حصّہ جو راجوں مہاراجوں کے تسلّط میں تھا اسے حق دے دیا گیا کہ وہ اپنے جغرافیائی، معاشی اور معاشرتی حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے جس ملک سے چاہیں الحاق کرلیں۔ بھارت کے پاس انگریز دائسرائے تھا اور اس کا ان ریاستوں میں بڑا دخل تھا۔ اس دائسرائے کی مدد سے بیشتر ریاستوں کو بھارت کے ساتھ الحاق پر مجبور کرلیا گیا۔ البتّہ تین ریاستیں ایسی رہ گئیں جن کا الحاق سنگین نزاع کا باعث بن گیا۔ ان تین ریاستوں میں سے ریاست جوناگڑھ کے نواب نے پاکستان سے الحاق کیا، لیکن بھارت نے جوناگڑھ پر حملہ کرکے ریاست پر غاصبانہ قبضہ جمالیا۔ کشمیر کے ہندو راجہ نے اپنی مسلمان رعایا کی منشا اور جغرافیائی حالات کے مطابق پاکستان سے معاہدہ جاریہ کرکے ریاست کی قسمت کو پاکستان سے وابستہ کردیا مگر بھارت نے یہاں بھی وہی کھیل کھیلا جو وہ جوناگڑھ میں کھیل چکا تھا۔ پاکستان سے مہاراجہ کشمیر کے معاہدہ جاریہ کے علی الرغم اس نے مہاراجہ سے الحاق نامہ پر دستخط کروائے اور اپنی فوجیں کشمیر میں اتار دیں۔ ان فوجوں کے وہاں پہنچتے ہی قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم ہوا کہ اس نے پاکستان کے عوام اور آزاد قبائل کو آتشِ زیرپا کردیا۔ ہزاروں مجاہدین رائفلیں تھامے کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کو پہنچنے لگے۔ ایک طرف بھارتی فوج، مہاراجہ کے ڈوگرے سورما اور سیوا سنگھی عناصر تھے اور دوسری طرف ریاست اور ملحقہ علاقوں کے مسلمان مجاہد ـــــ اس طرح جموں و کشمیر کی وادیوں اور پہاڑوں میں اس ہمہ گیر جنگ کا آغاز ہوگیا جو اس پوری جنّتِ ارضی پر آگ بن کر چھا گئی۔ پنڈت نہرو نے سمجھا تھا کہ الحاق نامہ پر مہاراجہ کے دستخطوں کے بعد بھارت بڑی آسانی سے کشمیر کے لالہ زاروں پر تسلّط جمالے گا۔ لیکن جلد ہی اس نے محسوس کرلیا کہ صورتِ حال مختلف ہے۔ چنانچہ بھارتی حکومت نے مجاہدوں کا سامنا کرنے کی بجائے سلامتی کونسل کا رُخ کیا۔ یو این او (UNO)

کی مداخلت پر یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو بیک وقت جنگ کی آگ سرد پڑ گئی اور طے پایا کہ کشمیر کے الحاق کا فیصلہ جمہوری طریق پر آزادانہ رائے شماری کے ذریعہ ہوگا۔ یہ تھی وہ تاریخی قرارداد جس کی دیانت دارانہ تعمیل سے ریاست کا خوشگوار مستقبل وابستہ تھا اور اسی سے بھارت اور پاکستان کے مابین وہ بنائے فساد ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتی تھی جو دونوں ملکوں کے عوام کو شمشیر بکف دیکھے ہوئے ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بھارت خود یہ مسئلہ سلامتی کونسل میں لے گیا تھا لیکن جب یہ فیصلہ منظرِ عام پر آیا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ بھارت کی مسلح فوجیں نہیں بلکہ کشمیر کے عوام کریں گے، تو بھارتی سامراج نے عدل و انصاف کے تقاضوں کے خلاف وہ ڈھٹائی اختیار کی کہ جس کی مثال تاریخ میں موجود نہیں۔

سلامتی کونسل کو قرارداد منظور کئے ۴۳ سال ہونے کو آئے ہیں۔ بھارت اور پاکستان کے مابین اس دوران دو مسلح تصادم ہو چکے ہیں۔ پاکستان سلامتی کونسل کے فیصلوں پر اب بھی قائم ہے اور ان پر عمل درآمد چاہتا ہے۔ اس کے خلاف بھارت ان فیصلوں سے کھلم کھلا انحراف کر رہا ہے۔ وہ علی الاعلان سلامتی کونسل میں اس ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہا ہے کہ وہ اس کی قراردادوں کا پابند نہیں۔ لیکن ستم ظریفی اور بے ضمیری کی انتہا یہ ہے کہ یو این او بھارت سے جواب طلبی کرنے کی بجائے اُسے موقع فراہم کرتی رہی ہے کہ وہ مسلمان آبادی کو ختم کر کے کشمیر میں اپنا تسلط قائم رکھ سکے حالانکہ بین الاقوامی ضابطہ، عدل و انصاف کا تقاضا اس کے سوا کچھ نہیں کہ بھارت اور پاکستان کو برابر کی سطح پر فریقین قرار دینے کی بجائے بھارت کو ایک مجرم کی حیثیت دی جائے اور ایک مجرم کی حیثیت سے اس سے یہ جواب طلب کیا جائے کہ سلامتی کونسل کے طے شدہ فیصلہ سے بغاوت اختیار کر کے اس نے اس عالمی ادارے کی جو توہین کی ہے اس کی وجہ جواز کیا ہے؟ یہ بغاوت وہ جرم ہے جس پر بین الاقوامی ضابطوں کو بہت پہلے حرکت میں آجانا چاہیئے تھا لیکن اگر اب تک یہ ممکن نہیں ہوا تو سلامتی کونسل کو چاہیئے کہ وہ اب یہ باعزت راستہ اختیار کرے ورنہ اس کی بے ضمیری اپنے ساتھ بہت کچھ لے ڈوبے گی۔

تعزیت

بزم طلوعِ اسلام جہلم کے جواں سال نمائندہ جناب قمر پرویز صاحب شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ مرحوم قرآن کے شیدائی اور تحریکِ طلوعِ اسلام کے مُحسن تھے کہ تحریک کو انہوں نے جناب قمر پرویز جیسا خیر اندیش کارکن فراہم کیا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ادارہ جناب قمر پرویز صاحب کے اس غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ خداوند قدوس مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

قرآن کا معاشی نظام

مَری سے ہمارے ایک کرم فرما جناب محمد ارشاد صاحب نے وزیرِاعظم پاکستان کے نام اپنے خط کے جواب میں موصول شدہ وزیرِاعظم سیکرٹریٹ اسلام آباد کا ایک خط ارسال کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

"حکومت کی یہ کوشش ہے کہ اسلامی معاشی نظام کو موجودہ نظام کی جگہ بتدریج نافذ کیا جائے تاکہ عوام اس آفاقی نظام کے ثمرات سے مستفید ہو سکیں۔"

حکومت کے اس عزم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ہم حکومت اور عوام کے استفادہ کے لئے مذکورہ خط اور علامہ غلام احمد پرویزؒ کا مقالہ بعنوان 'قرآن کا معاشی نظام' اس شمارہ میں بیک وقت شائع کر رہے ہیں تاکہ اس معاشی نظام کا ڈھانچہ استوار کرنے میں مدد مل سکے جسے حکومت موجودہ نظام کی جگہ نافذ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ (ایڈیٹر طلوعِ اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Prime Minister's Secretariat (Public)
Islamabad.

نمبر- ۱۸۷۲۷/۹۱

مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ء

محترم جناب محمد ارشاد صاحب

السلام علیکم!

عزت مآب جناب وزیرِاعظم صاحب کے نام آپ کا مراسلہ ہمراہ سید نواب حیدر نقوی صاحب کی رپورٹ کے موصول ہوا۔

آپ نے جس خلوص سے اسلامی معاشی اصلاحات کی ضرورت پر زور دیا ہے اور اس پر عمل درآمد کرنے کے لئے جلد از جلد اقدامات کرنے کی سفارش کی ہے وہ جذبہ قابلِ قدر ہے۔ جس کے لئے جناب وزیرِاعظم صاحب آپ کے تہہ دل سے شکرگزار ہیں۔ حکومت کی یہ کوشش ہے کہ اسلامی معاشی نظام کو موجودہ نظام کی جگہ بتدریج نافذ کیا جائے تاکہ عوام اس آفاقی نظام کے ثمرات سے مستفید ہو سکیں۔ اس سلسلے میں آپ کی تجاویز سے استفادہ کیا جائے گا۔

دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی مملکت بنانے میں کامیابی عطا فرمائے۔ آپ کی خواہش کے مطابق رپورٹ کی کاپی واپس کی جا رہی ہے۔

والسلام　آپ کا خیراندیش

(خیام قیصر)

پرائیویٹ سیکرٹری برائے وزیراعظم

جناب محمد ارشاد، مدرس
بمقام و ڈاک خانہ چارہان براستہ گھوڑہ گلی
تحصیل مری، ضلع راولپنڈی

قرآن کا معاشی نظام

اس کا مطالعہ گہری توجہ کا متقاضی ہے

پرویز

قرآن کریم، نظری پند و نصائح کا مجموعہ یا پوجا پاٹ کے طور طریقے سکھانے والی کتاب نہیں۔ وہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لئے عملی ہدایات دیتا ہے تاکہ ان کے مطابق انسان، ایک نظام متشکل کر کے صحیح انسانی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ زندگی جن ارتقائی مراحل کو طے کر کے موجودہ سطح (یعنی پیکرِ انسانی) تک پہنچی ہے اس میں طبیعی نظامِ حیات یعنی اس کے جسم کی پرورش اور نشو و نما کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام ضوابطِ اخلاق و تمدن۔ تمام پند و نصائح۔ دین کا ہر قسم کا تقاضا، عبادات و مناسک شریعت۔ فرد اور جماعت کے حقوق و فرائض۔ غرضیکہ ہر قسم کی راہنمائی صرف زندہ انسانوں کے لئے ہے۔ مردہ (یعنی انسان کی لاش) نہ مومن ہوتا ہے نہ کافر۔ نہ گنہگار ہوتا ہے نہ معصوم۔ وہ ہر قسم کی ذمہ داریوں سے بری اور ہر نوع کے حقوق و فرائض سے مبرا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی جان (یعنی) اس کی طبیعی یا جسمانی (زندگی) اس قدر گراں بہا ہے کہ (اس نے کہا ہے کہ) جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق ہلاک کر دیا۔ اس نے گویا تمام نوعِ انسان کو ہلاک کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچا لیا اس نے (یوں سمجھو گویا) تمام نوعِ انسان کی جان بچا لی۔ (۵/۳۲) اسی لئے اس نے جرمِ قتل کی سزا سنگین ترین مقرر کی ہے۔ (۴/۹۲-۹۳) اب ظاہر ہے کہ جب انسان کی زندگی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے تو جن اسباب و ذرائع پر اس کا دارومدار ہے، ان کی اہمیت کس قدر ہو گی؟ ان اسباب و ذرائع کو، قرآن کریم کی اصطلاح میں رزق، اور (ہمارے ہاں) عرفِ عامہ میں روٹی کہا جاتا ہے۔ روٹی سے متعلق

روٹی کے مسئلہ کی اہمیت

مباحث کو، دورِ حاضر کی علمی اصطلاح میں معاشیات اور علمِ معیشت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے،

روٹی کے مسئلہ یا معاشیات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے افتتاحیہ (یعنی سورۂ فاتحہ) میں مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ دکھا ہم کو راہ سیدھی، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے اپنا انعام کیا۔ (۱/۵-۶)
اور سورۂ نحل میں بتایا گیا ہے کہ امن اور رزقِ فراواں، انعاماتِ خداوندی میں سے ہیں (۱۶/۱۱۲) اور بھوک اور خوف، خدا کا عذاب ہے (۱۶/۱۱۲) اس نے "جنتِ آدم" کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں نہ کسی کو بھوک اور پیاس کی احتیاج ستائیگی، نہ مکان اور لباس سے محرومی ہوگی (۲۰/۱۱۸)۔ اس میں ہر شخص کو، جہاں بھی وہ ہوگا، فراوانی سے کھانے کو مل جائے گا۔ (۲/۳۵، ۷/۱۹) اس نے سورۂ طٰہٰ میں واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو شخص ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی رزق تنگ ہو جائے گی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تصریح کر دی کہ جس شخص کی یہاں روزی تنگ ہوگی وہ قیامت میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا (۲۰/۱۲۴)۔ دوسری جگہ کہہ دیا کہ جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہوگا (۱۷/۷۲) سورۂ مائدہ میں ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ، تورات و انجیل کا اتباع کرتے تو ہم انہیں زمین و آسمان سے بکثرت کھانے کو عطا کر دیتے۔ (۵/۶۶) یعنی ان پر زمین اور آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ (۷/۹۶)

دعائے ابراہیمی رزق کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگائیے، کہ حضرت ابراہیمؑ جب "دنیا میں خدا کے پہلے گھر" کی تعمیر سے فارغ ہوئے، تو انہوں نے حریمِ کعبہ میں کھڑے ہو کر، خدا سے جو پہلی دعا مانگی اس میں کہا کہ "اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو یہاں کے رہنے والوں کو امن اور فراوانی سے سامانِ رزق عطا فرما (۲/۱۲۶) اس دعائے ابراہیمیؑ کو سورۂ ابراہیم میں بھی دہرایا گیا ہے۔ (۱۴/۳۷) اور اہل مکہ کو اس کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ خدا نے انہیں کس طرح ہر خطرہ سے محفوظ رکھا ہے اور کس طرح ہر طرف سے رزق فراواں ان کی طرف کھنچے چلا آتا ہے۔ (۱۰۶/۴)۔ (۲۸/۵۷)
ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے روٹی کے مسئلہ کو کسقدر اہمیت دی ہے اور اس کی یہی وہ اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر اس نے،

---

۱ قلتِ گنجائش کی وجہ سے آیات کے صرف حوالے دیئے گئے ہیں۔ آپ انہیں قرآن کریم کے نسخہ سے خود دیکھ لیں اور ان کا مفہوم، مفہوم القرآن سے معلوم کر لیں۔ ان حوالوں میں اوپر سورۃ کا نمبر ہے اور نیچے آیت یا آیات کا۔

اس کے لئے چند نظری ہدایات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک مکمل عملی نظام عطا کر دیا ہے۔ میں آج کی نشست میں قرآن کے اس عملی نظام کو آپ حضرات کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس نظام کو سمجھنے کے لئے، دو ایک بنیادی نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے جنہیں نظر انداز کر دینے سے وہ الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے، ایک ہی معاشی نظام کو ایک گروہ عین مطابق اسلام قرار دیتا ہے اور دوسرا اسے، کفر ہی نہیں بلکہ "کفرِ عظیم" ٹھہراتا ہے۔

تمہیدی اصول

وہ تمہیدی نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی سب سے پہلی مخاطب قوم وہ تھی جس کے ہاں ایک ایسا معاشی نظام رائج تھا جو اس نظام کی یکسر ضد تھا جسے قرآن متشکل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک نافذ شدہ نظام کی جگہ دوسرا نظام۔ جو اس کی یکسر ضد ہو شباشب نہیں لایا جا سکتا، بالخصوص، جب اس نئے نظام کے لئے ان لوگوں کے قلب و دماغ میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی بھی ضروری ہو، جن کے ہاتھوں اسے متشکل ہونا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ تبدیلی تیئس برس میں پیدا کی اور اس طرح اس قوم کو، رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ، قدم بہ قدم بتدریج اس نظام نو تک لے گیا جو اس کی تعلیم کا منتہیٰ تھا۔ فساد، راتوں رات برپا کیا جا سکتا ہے۔ انقلاب اسی طرح، بتدریج لایا جاتا ہے۔ قرآنی نظامِ معیشت کے سمجھنے کے لئے، ہمیں ان تدریجی کڑیوں کے ساتھ ساتھ چلنا ہوگا جن کو ملاتے ہوئے وہ آخری منزل تک پہنچا تھا۔

قرآن کریم جس مرتب شکل میں امت کو دیا گیا ہے وہ اس کے نزول کی تاریخی ترتیب نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جو سورۃ (یا آیت) سب سے پہلے نازل ہوئی تھی وہ قرآن میں سب سے پہلے رکھی گئی ہے، اور سب سے آخری سورۃ یا آیت وہ ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی تھی۔ اس کی ترتیب میں ایک اور انداز اختیار کیا گیا ہے۔ میں اپنے موضوع سے دُور نکل جاؤں گا ورنہ میں اپنے مطالعہ قرآن کی بناء پر اس کی وضاحت کرتا کہ جس کتابِ عظیم کو تمام نوعِ انسان کے لئے، ہمیشہ کے لئے، ضابطۂ ہدایت بننا تھا، اس کے لئے یہی انداز ترتیب کس طرح انسب ہی نہیں بلکہ ضروری تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ جب قرآن کی موجودہ ترتیب، اس کی تنزیلی ترتیب نہیں تو ان کڑیوں کو کیسے مرتب کیا جائے گا جن کے مطابق وہ اپنے نظام کو، اس کے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک لے گیا تھا۔ بظاہر یہ مسئلہ کچھ دقت طلب سا نظر آتا ہے لیکن

تدریجی کڑیاں درحقیقت ایسا نہیں۔ اگر قرآن کریم کا دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ان تمام کڑیوں کو بآسانی آپس میں ملایا جا سکتا ہے جن کے اتصال سے ہم اس نظام کی پہلی کڑی سے آخری نقطہ تک، موجِ خرامِ یار کی طرح گل کترتے، بلا دقت و بلا تردد پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے قرآنِ کریم کا مطالعہ اسی انداز سے کیا ہے اور اس سے یہ راستے کتنے آسان ہو گئے ہیں اس کا اندازہ آپ ان کڑیوں سے بخوبی لگا سکیں گے جو ابھی آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

نشانِ منزل قرآنِ کریم نے سب سے پہلے اس منزل کا نشان واضح طور پر متعین کر دیا ہے جس تک وہ ہمیں بتدریج لے جانا چاہتا ہے۔ اس نشانِ منزل کی وضاحت سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت میں ان الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ (۱/۱)

خدا موجب حمد و ستائش اس لئے ہے کہ اس نے جملہ اشیائے کائنات کی پرورش اور نشوونما کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اسے ربوبیتِ عالمین کہتے ہیں اور یہ انتظام وہ ہے جسے خدا کے سوا نہ کوئی اور کر سکتا تھا، نہ کر سکتا ہے۔ نہ کر سکے گا۔ (۳۵/۳) خارجی کائنات میں اس کا یہ نظامِ ربوبیت کس طرح کارفرما ہے، یہ سوال ہمارے موضوع زیرِ نظر سے خارج ہے۔ کرۂ ارض کے متعلق اس نے کہہ دیا کہ "اس میں کوئی ذی حیات (دآبۃ) ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔" (۱۱/۶) اور ان میں سے انسانوں کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ان کے، اور ان کی اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہم ہیں۔

(۶/۱۵۲ و ۱۷/۳۱ و ۲۹/۶۰)

لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم ہر انسان کو براہِ راست رزق پہنچاتے ہیں۔ بالکل نہیں (۳۶/۴۷) ہماری یہ ذمہ داری، انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہے۔ جو انسانی نظام، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرتا ہے اسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے، اور اس کے اس نظام کو قرآنی نظامِ معیشت۔ یعنی جو مملکت خدا کے نام پر قائم ہونے کی مدعی ہو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ جملہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی (رزق) بہم پہنچائے۔ اب آپ ان کڑیوں کو دیکھئے جن کے باہمی جوڑ

یہ نظام بتدریج اپنے مقامِ تکمیل تک پہنچتا ہے۔

منزلِ اوّل

(انفرادی زندگی)

نزولِ قرآن سے، اس نظام کی آواز اس معاشرہ میں بلند کی جاتی ہے جو نظامِ سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس میں ایک طرف، ایسے متمول افراد ہیں جو اپنی دولت کے نشہ میں، بدمست ہیں۔ اور دوسری طرف ایسے مفلوک الحال جو نانِ شبینہ تک سے بھی محروم ہیں: اس معاشرہ میں سب سے پہلے متمول لوگوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ ان ناداروں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام کریں جو خود اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے سے کسی طرح معذور ہو چکے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے ان مسکینوں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام نہ کیا تو یاد رکھو! تم پر جہنم کا عذاب مسلط ہو جائے گا۔ (۶۹/۳۴-۲۵)۔ (۲۶/۸-۱) اُخروی زندگی میں یہ عذاب کس قسم کا ہوگا، اس سے ابھی زیادہ بحث نہیں کی جاتی۔ لیکن انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر تم نے معاشرہ کا موجودہ نقشہ نہ بدلا جس میں بیشتر انسان اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی تک سے محروم رہتے ہیں تو ملک میں ایسا فساد برپا ہوگا، جس میں تمہاری عزتیں خاک میں مل جائیں گی۔ اس وقت تم حواس باختہ ہو کر پوچھو گے کہ ایسا کیوں ہوا۔ فطرت کا اٹل قانون تمہیں بتلائے گا کہ یہ اس لئے ہوا کہ تمہارے ہاں عزت و تکریم کا معیار دولت اور جتھہ کی اکثریت تھی۔ تم میں سے جو تنہا رہ جاتا تھا تم اسے عزت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور جس کا چلتا ہوا کاروبار کسی حادثہ کی وجہ سے رُک جاتا تھا، تم نہ خود اس کی روٹی کا انتظام کرتے تھے، نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دلاتے تھے۔ (۸۹/۷-۶)۔ ان میں سے جو لوگ اس نئی آواز پہ لبیک کہہ کر اس داعیٔ انقلاب کی رفاقت کا عہد کرتے (انہیں جماعتِ مومنین کہا جاتا تھا۔) ان سے بھی کہا جاتا کہ یاد رکھو! اس آواز کی ہمنوائی سے تم بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر پہ لیتے ہو۔ تمہیں محتاجوں۔ یتیموں اور اسیروں کی روٹی کا انتظام کرنا ہوگا،

انفرادی اپیل

اور ستائش کی تمنا اور صلہ کی امید کے بغیر ایسا کرنا ہوگا۔ (76/8-9) یہ نہایت سخت گھاٹی ہے جس پہ تمہیں چڑھنا ہوگا (90/11-16) جو ایسا نہیں کرے گا وہ اپنے دعویٰ ایمان کی تکذیب کرے گا۔ (107/1-3) تمہارے دعوئے ایمان کی صداقت کا ثبوت یہ ہوگا کہ تم محتاجوں اور ناداروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کیا کچھ دیتے ہو۔ اسے قرآن کی

صدقات

اصطلاح میں صدقہ کہتے ہیں۔ اس کی ابتداء تم اپنے اعزہ و اقارب سے کرو اور پھر، اس کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے، اپنے اور بیگانے کی تمیز سے بلند ہو کر، ہر ضرورت مند کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرو۔ (2/215 : 30/38) لیکن ایسا نہ ہو کہ جس محتاج کی کوئی ضرورت پوری کرو اس کے سر پہ احسان کی من بھر کی سِل رکھ دو کہ وہ بیچارہ ساری عمر اس کے بوجھ تلے دبا رہے۔ نہ ہی اسے لوگوں کو دکھا دکھا کر، اپنے پندارِ نفس کی تسکین کا سامان پیدا کرو۔ اسے انسانیت کا فریضہ سمجھ کر ادا کرو۔ عقلِ فریب کار تم سے یہ کہے گی کہ ہم دوسروں پہ خرچ تو کریں لیکن اس سے نہ ان لوگوں سے اپنا احسان منوائیں اور نہ ہی معاشرہ میں پاپولر ہونے کے لئے لوگوں میں اس کا چرچا کریں، تو ہم اپنی دولت دوسروں پہ خرچ کیوں کریں؟ تم اسے سمجھاؤ کہ جو کچھ اس طرح سے خرچ کیا جائے گا وہ ضائع نہیں جائے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کسان بیج کے دانے مٹی میں ملا دیتا ہے تو وہ ضائع نہیں جاتے۔ ایک ایک دانے کے عوض سینکڑوں دانے اسے واپس مل جاتے ہیں۔ ان صدقات سے ایسے معاشرہ کی بنیاد رکھی جائے گی جس میں حقوقِ انسانیت محفوظ ہو جائیں گے اور تم اس تباہی سے بچ جاؤ گے جو انسانی ناہمواریوں کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ (2/261-276)۔ (4/31)

مال و دولت میں اصلاح

قرآنِ کریم نے اس پہلی اسٹیج پر، جہاں ایک طرف، ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کی انفرادی طور پہ ترغیب و تحریص دی، اس کے ساتھ ہی دوسری طرف، مالی معاملات میں اصلاح کی ہدایات بھی دیں۔ اس نے کہا کہ دوسروں کا پیسہ، باطل طور پہ مت کھاؤ۔ (2/188) (4/29) اس سلسلہ میں اس کی تصریح کر دی کہ مذہبی علماء و مشائخ، لوگوں کا مال باطل طور پر کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں کچھ نہ دو۔ وہ خود محنت کر کے کمائیں کھائیں۔ (9/34) یتیموں کے مال کی حفاظت کرو (4/6 - 6/152 - 17/34) اگر عورت کچھ کمائے تو مرد خواہ مخواہ غاصبانہ طور پر اس کے مالک نہ بن جائیں۔ عورت اپنی کمائی کی مالک ہوگی، مرد اپنی کمائی کا۔ (4/32) لین دین کے معاملات کے متعلق تاکید کی کہ انہیں ضبطِ تحریر میں لے آیا کرو۔ (2/282) مقروض اگر تنگدست ہو تو اسے قرض کی ادائیگی کے لئے مہلت دو۔ اور اگر اس میں ادائیگی قرضہ کی استطاعت نہ ہو، تو اسے قرضہ معاف کر دو۔ (2/280) اپنے ترکہ کے

کرو۔ (۲/۱۸۰ - ۵/۱۰۶) اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ متوفی وصیت نہیں کر سکا۔ یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہیں ہوتی، تو ترکہ کی تقسیم ان احکام کے مطابق کر دو جو قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں۔ (۴/۷ - ۴/۱۱-۱۲)، اور جن کی رو سے دولت ایک جگہ مرکوز ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ خرید و فروخت یا آجر و مستاجر (مزدور) کے تعلقات میں حسنِ معاملہ کے سلسلہ میں باربار تاکید کی کہ کبھی کم نہ تولو، خریدار کو اس کی قیمت کے بدلے میں صحیح صحیح چیز دو۔ مزدور کی مزدوری، قاعدے اور معاہدے کے مطابق ادا کرو۔ (۶/۱۵۲ - ۷/۸۵ - ۱۱/۸۴ - ۱۷/۳۵ - ۸۳/۱-۳)

زرعی اصلاح

عربوں کی معیشت (بالخصوص مکہ میں) زرعی نہیں تھی۔ اس لئے اس منزل میں زیادہ تر توجہ کاروباری معاملات کی اصلاح کیطرف مبذول کرائی گئی۔ زرعی اصلاح کے سلسلہ میں کہا گیا کہ جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ اس میں سے بھی نادار ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو، اور زمین کی پیداوار میں سے بھی (۲/۲۶۷)۔ اسے "خدا کا حق" کہہ کر پکارا گیا۔ (۶/۱۴۲) (ایسا کیوں کہا گیا، اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی[1])۔ جس طرح صدقات کے سلسلہ میں کہا تھا کہ اگر تم نے مفلوک الحال محتاجوں کی ضروریات پوری نہ کیں تو معاشرہ میں ایسا فساد برپا ہو جائے گا جو تمہارے موجودہ مقاماتِ عزت و تکریم کو الٹ کر رکھ دے گا۔ اسی طرح زمین کے سلسلہ میں بھی کہا کہ اگر تم نے اس میں سے "خدا کا حق" محتاجوں کو نہ دیا تو تمہارے کھیتوں کا ہر دانۂ گندم جل کر راکھ ہو جائے گا۔ (۶۸/۱۷-۳۳) - (۱۸/۳۲-۴۴) اور تمہارے باغ پھول تک تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ (۲/۲۶۶)

منزل دوم

(اجتماعیت کی طرف اقدام)

منزلِ اول میں تمام ہدایات اور تاکیدات انفرادی تھیں۔ اس دوران میں، وہ لوگ جو اس دعوتِ انقلاب کی صداقت کے قائل ہو گئے، اس داعیٔ انقلاب کے

---

[1] حقوق اللہ اور حقوق العباد کے متعلق، مطالب الفرقان۔ جلد پنجم۔ صفحہ ۱۳۲) دیکھئے۔

گرد جمع ہوتے چلے گئے اور اس طرح ان کا (یوں کہئے کہ) ایک الگ معاشرہ وجود میں آنا شروع ہوگیا۔ یہ اس پروگرام کی دوسری منزل تھی۔ اس میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف قدم اٹھایا گیا۔ منزلِ اوّل میں، افراد سے کہا گیا تھا کہ وہ ناداروں اور محتاجوں کی اپنے اپنے طور پر مدد کریں۔ (ایسے

صدقات کا اجتماعی نظم ونسق

"صدقات" سے تعبیر کیا گیا تھا) اب کہا کہ صدقات (اپنے عطیات) کو اپنے اپنے طور پر خرچ نہ کرو بلکہ اسے اپنے نظام کے مرکز کے پاس جمع کرو۔ بلکہ اس مرکزِ نظام (یعنی نبی اکرمؐ) سے کہا گیا کہ ان کے صدقات خود وصول کرو (۹/۱۰۳) اور اس مال کو معاشرہ کے فلاحی امور کے لئے ان مدات پر صرف کرو جن کا ذکر سورۃ توبہ کی آیت ۶۰ (۹/۹) میں آیا ہے۔ پہلے کہا گیا تھا کہ اہل حاجت کو قرض دیا کرو اور اس کی ادائیگی میں مقروض کی سہولت کو پیشِ نظر رکھا کرو۔ اب کہا کہ "قرض اللہ کو دیا کرو" (۵۷/۱۸ - ۶۴/۱۷)۔ یعنی جب تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (یعنی نبی اکرمؐ) کسی اجتماعی ضرورت کے لئے اپیل کرے، تو جو کچھ کسی سے بن پڑے، اسے دے دیا کرے۔ وہ اس قرضہ کو تمہارے حفاظتی امور میں صرف کرے گا۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد، جب تمہارا معاشرہ مضبوط ہو جائے گا اور یہ نظام نو پوری طرح متشکل، تو جو کچھ تم اب "اللہ کو" بطور قرض دو گے، اس کی پائی پائی تمہیں واپس مل جائے گی۔ (۲/۲۴۵) لیکن اگر تم نے اس وقت بخل سے کام لیا، تو پھر تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس لئے تم اپنے ہاتھوں اپنی تباہی مول نہ لو۔ (۲/۱۹۵) یہ ہلاکت یا تباہی کیا ہوگی؟ یہ کہ تم مٹ جاؤ گے اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ (۴۷/۳۸) انفرادی مفاد پرستی کے جذبات (جنہیں شیطانی وساوس کہا جاتا ہے) تمہیں ورغلائیں گے کہ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو۔ وقت پر تمہارے کام آئے گا (۲/۲۶۸)۔ لیکن تم اس فریب میں نہ آجانا۔ معاشرہ میں ناہمواریوں سے جو فساد رونما ہوتا ہے اس میں انفرادی میکبتیں کچھ کام نہیں آیا کرتیں۔ ایسا سمجھنے والے (کہ ہمارا ذاتی پیسہ ہمیں تباہی سے بچالے گا) اور دوسروں کو بھی اسی قسم کی پٹی پڑھانے والے، تباہیوں اور ہلاکتوں کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھاتے ہیں۔ (۴۷/۳۸ - ۵۷/۲۴ - ۹۲/۱۸) یاد رکھو! جو کچھ تم اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے دو گے اس سے تمہاری حفاظت ہی نہیں ہوگی، بلکہ مزید نشوونما بھی ہوتی جائے گی۔ (۹۲/۱۸) تمہاری طبیعی

ص۱ نبی اکرمؐ اسلامی مملکت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس نظام کے مرکز اوّل تھے۔

ص۲ یہ "صدقات" کے مصارف ہیں جنہیں ہمارے ہاں "زکوٰۃ" کے مصارف سمجھ لیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

نشوونما بھی اور تمہاری ذات کی نشوونما بھی جو درحقیقت منتہیٰ ومقصود ہے موجودہ سطحِ زندگی کی تمام تگ وتاز اور جدوجہد کا ـــــ انسانی ذات کی نشوونما کو اصطلاح میں "قربِ خداوندی" کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے انسان میں (حدِ بشریت کے اندر) خدا کی صفات کی نمود ہوتی ہے۔ یہ "تقرب الی اللہ" مال ودولت جمع کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اسے "خدا کو دے دینے" سے ہوتا ہے۔ (۳۴/۳۷) اس میں شبہ نہیں کہ زن وفرزند کی طرح، مال ودولت میں بھی کشش وجاذبیت ہے (۳/۱۴)۔ لیکن اگر زن وفرزند

مال ودولت کے نظام میں اصلاح

یا مال ودولت کی جاذبیت، اجتماعی مفادِ انسانیت پر غالب آجائے، تو یہی زن وفرزند اور مال ودولت فتنہ بن جاتے ہیں (۶۴/۱۵)۔ اس لئے تم انفرادی مفادپرستی کے فریب میں نہ آؤ، اسی سے تمہیں کامیابی نصیب ہوگی (۶۴/۱۶-۱۷)۔ انفرادی دولت جمع کرکے یہ نہ سمجھ لو کہ تم معاشرہ کے اجتماعی تعاون سے مستغنی ہوگئے ہو۔ تم خود کفیل (SELF-SUFFICIENT) ہوگئے ہو۔ قطعاً نہیں۔ جو ایسا سمجھتا ہے تباہ ہوجاتا ہے (۹۲/۸-۱۱ - ۹۶/۷)

سائل ومحروم کا حق

منزلِ اوّل میں، ضرورت مندوں کی امداد کے لئے اپیل کی گئی تھی جس کے معنی یہ تھے کہ وہ تم سے اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگتے، تم انہیں بطورِ امداد کچھ دو۔ لیکن اب کہا کہ تمہارے مال ودولت میں ضرورتمندوں کا حق ہے۔ یعنی وہ اس میں سے، اپنی ضروریات کے بقدر، بطور استحقاق ـــــ (AS OF RIGHT) لے سکتے ہیں (۵۱/۱۹ - ۷۰/۲۴-۲۵)۔ اگر تم خود ان کے اس حق کو ادا نہ کروگے، تو معاشرہ تم سے ان کا یہ حق دلوائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ اس منزل میں صدقات کی حیثیت خیرات کی نہیں رہی حق کی ہوگئی۔ خیرات لینے والا ذلت محسوس کرتا ہے اور دینے والے کے دل میں اس سے جذبۂ احسان اُبھرتا ہے۔ لیکن جو چیز بطورِ حق وصول کی جائے، اس سے نہ لینے والے کے دل میں احساسِ کمتری (INFERIORITY-COMPLEX) پیدا ہوتا ہے نہ دینے والے کے دل میں جذبۂ برتری (SUPERIORITY-COMPLEX)

مالِ غنیمت

عربوں کے ہاں، مالِ غنیمت بہت بڑا ذریعہ آمدنی تھا، اور ان کے معاشرہ کا رواج یہ تھا کہ جنگ میں، جو کچھ کوئی دشمن کا لوٹ لے، وہ اسی کا ہوجاتا تھا۔ قرآن کریم نے اس میں بھی اصلاح کی اور کہا کہ مالِ غنیمت، انفرادی ملکیت نہیں ہوگا۔ اسے مرکز میں جمع کرنا ہوگا، مرکز اس میں سے ایک حصہ، اجتماعی ضروریات کے لئے الگ کرکے، باقی مال، سپاہیوں میں تقسیم کرے گا۔ (۸/۱ - ۸/۴۱) اس ایک تبدیلی سے، نہ صرف یہ کہ اس ذریعہ آمدنی کی حیثیت اجتماعی ہوگئی، بلکہ جنگ

کا جذبۂ محرکہ بھی بدل گیا۔ پہلے جنگ کا جذبۂ محرکہ لوٹ کا مال حاصل کرنا تھا۔ جو جتنا حاصل کر سکے، لے جائے۔ اب جذبہ، حقوقِ انسانیت کی مدافعت قرار پا گیا۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں قتال فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں جنگ۔ واضح رہے کہ جو کچھ اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے بلا مزد و معاوضہ کیا جائے، اسے قرآن کی رُو سے فی سبیل اللہ (یعنی اللہ کی راہ میں) کہا جاتا ہے

دولت کا اکتناز

دولت اُسی صورت میں اپنا مقصد پورا کر سکتی ہے جب یہ گردش میں رہے۔ خود لفظ دولت کے معنی گردش کرنے کے ہیں۔ لیکن انفرادی ہوسِ زر پرستی، اسے گردش میں رکھنے کے بجائے، جمع کر کے روک لیتی ہے۔ اس سے معاشرہ کا اقتصادی نظام اُلٹ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بڑے تہدید آمیز انداز میں کہا کہ دولت کا اکتناز۔ یعنی اسے جمع کر کے روک رکھنا۔ سنگین ترین جرم ہے۔ اس سے جہنم کے شعلے بھڑکتے ہیں جن میں یہ دولت اور اس کے جمع کرنے والے، دونوں، بُری طرح جھلستے اور جلتے ہیں۔ (۹/۳۴-۳۵) یہ شعلے، ان کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے آتے ہیں۔ (۱۰۴/۶-۷) یہ اس آگ سے لاکھ بچنا چاہیں لیکن وہ انہیں آوازیں دے دے کر بلا لیتی اور آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کیطرح، ان کا سب کچھ تباہ کر دیتی ہے۔ (۷۰/۱۵-۱۸)

دولت کو گردش میں رکھنے کے سلسلہ میں اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ اوپر کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ اسے پورے کے پورے معاشرہ کے رگ و پے میں اس طرح گردش کرتے رہنا چاہیئے جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے (۵۹/۷)

ربوٰ قرآنی نظام کے خلاف جنگ ہے

دولت جمع کرنے کے خلاف اس قسم کی تنبیہات و تاکیدات کے بعد، اس نے ایک ایسا حکم دیا جس سے دولت جمع کرنے کے مقصد اور جذبہ ہی کو جڑ سے کاٹ دیا۔ روپیہ، مبادلہ اشیائے ضروریہ کا ذریعہ ہے۔ اس سے از خود کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ایک سو روپیہ کسی بکس میں رکھ دیجئے۔ اسے آپ دس برس کے بعد بھی نکالیں گے تو وہ سو کا سو ہی ہوگا۔ وہ ایک پیسہ بھی پیدا نہیں کرے گا۔ اگر روپے کی حیثیت یہی رہے کہ وہ جتنی دیر جی چاہے پڑا رہے، اس میں کوئی اضافہ نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ روپیہ جمع کر کے رکھ چھوڑنا حماقت ہوگا۔ لیکن اگر آپ وہی سو روپیہ کسی کو سود پر دے دیں تو وہ روپیہ اپنے ساتھ کچھ اور روپے لے کر آئے گا۔ یعنی اب آپکا روپیہ، اپنے جیسے اور روپے پیدا کرے گا۔ جو روپیہ، محنت سے نہیں بلکہ روپے سے

از خود پیدا ہو، اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں رِبٰوا کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے رِبٰوا کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ حرام ہے اور سنگین ترین جرم۔ ایسا جرم جسے اس نے، اسلامی نظام کے مدِّ مقابل ایک باغی نظام قرار دیا۔ اور کہہ دیا کہ ایسا نظام قائم کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو ہماری طرف سے اعلانِ جنگ سمجھیں۔ (۲/۲۷۹-۲۷۵) دلیل کے طور پر اس نے کہا کہ رِبٰوا سے تمہاری انفرادی دولت میں بے شک اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس نظامِ معیشت کے نتائج و عواقب اس قدر مضرت رساں ہیں کہ انجام کار اس سے اجتماعی دولت میں بیحد کمی واقع ہو جاتی ہے، ایک طبقہ، دوسروں کی محنت کا غاصب بن کر، قوتِ عمل سے محروم اور سعادتِ انسانیہ سے عاری ہو جاتا ہے، اور دوسرا طبقہ اپنی محنت کے ماحصل سے محروم ہو کر مفلس و نادار ہو جاتا ہے۔ اور اس سے اس کے سینے میں انسانیت کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ پہلے سلگتی رہتی ہے اور آخرالامر بھڑک اٹھتی ہے (۳/۱۳۰-۱۲۹)

واضح رہے کہ قرآن کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ کسی ضرورت مند کو قرضہ دے کر اس سے جو زائد روپیہ لیا جائے وہی رِبٰوا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو روپیہ تم، دوسروں کے روپے کے ساتھ اس مقصد سے شامل کر دو کہ اس سے تمہیں کچھ زائد حاصل ہو جائے گا، وہ بھی رِبٰوا ہے۔ (۳۰/۳۹) اسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں کمرشل انٹرسٹ کہا جاتا ہے۔ نیز اس میں مضاربت (SLEEPING-PARTNERSHIP) اور مزارعت (زمین کی بٹائی یا کرایہ) وغیرہ سب آ جاتے ہیں۔ اس نے اصول یہ بتایا کہ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹) معاوضہ صرف محنت کا ہے، سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ رِبٰوا ہے خواہ اس کی کوئی سی شکل بھی کیوں نہ ہو۔

رِبٰوا کو حرام قرار دے کر، قرآن نے روپیہ جمع کرنے کا مقصد اور جذبہ ہی ختم کر دیا۔[1]

زمین کے متعلق اگلا قدم

اب آگے بڑھیے۔ انسانی معیشت میں زمین کے مسئلہ کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا گیا ہے حالانکہ بات اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے نہ کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت پڑتی ہے نہ ارسطو کے منطق کی حاجت۔ خدا نے اپنے آپ کو اَلْحَيُّ کہنے کے ساتھ ہی اَلْقَيُّوْمُ بھی کہا ہے۔ یعنی زندگی عطا کرنے والا اور زندگی کو قائم رکھنے والا۔ اس کے معنی یہ

---

[1] طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۸۴ء میں پرویز صاحب کا ایک جامع مقالہ شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ الرِّبٰوا درحقیقت، نظامِ سرمایہ داری کی قرآنی اصطلاح ہے۔

ہیں کہ اس نے زندگی عطا کی تو زندگی کے قائم رہنے کے لئے جس قدر سامان و اسباب کی ضرورت تھی، اسے بھی ساتھ ہی عطا کر دیا۔ قیامِ زندگی کے لئے روشنی، حرارت، ہوا، پانی اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے ان تمام اشیاء کو، انسان کے پیدا کرنے سے پہلے، مہیا کر دیا۔ روشنی، حرارت، ہوا اور پانی تو عام طور پر سطح ارض کے اوپر موجود رہتے ہیں۔ خوراک کے متعلق اس نے کہا کہ اس کے ذخائر زمین میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ انسان، انہیں اپنی ضرورت کے مطابق نکال لے۔ (۱۵/۲۱) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ۔ (۱۵/۲۰)۔ "ہم نے اس میں تمہارے لئے سامانِ معیشت رکھا ہے اور ان کے لئے بھی جن کے تم رازق نہیں ہو۔" آپ غور کیجئے کہ "معیشت" کا لفظ قرآن نے زمین کی پیداوار کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ (۲۰/۵۴) دوسری جگہ اس نے اسے مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ کہا ہے۔ (۷۹/۳۳ - ۸۰/۳۲)

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، ارض اور دیگر ذرائع حیات انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ اب آپ سوچئے کہ دنیا کے کسی مبنی بر عدل قانون اور قاعدے کی رُو سے، کوئی شخص، ان ذرائع حیات (حرارت، روشنی، ہوا، پانی، زمین) میں سے کسی کا مالک قرار پا سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے مشترکہ اور یکساں درجہ قیامِ زندگی ہوں۔ آج آپ کہہ سکتے کہ میں نے یہ قطعۂ زمین فلاں شخص سے خریدا ہے یا اپنے باپ سے ورثہ میں پایا ہے۔ آپ اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لوٹاتے جایئے اور اس شخص تک پہنچ جایئے جس نے سب سے پہلے اس قطعہ اراضی کو اپنی ملکیت کہا تھا۔ آپ اس سے پوچھئے کہ اس نے اسے کس سے خریدا یا کس سے ورثہ میں پایا تھا؟ ظاہر ہے کہ اس نے دھاندلی سے اس قطعہ کو اپنی ملکیت بنا لیا تھا۔ اب جو چیز شروع میں دھاندلی سے کسی کے قبضہ میں آئی ہو، اس پر، اس کے بعد آنے والوں کا قبضہ کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ذرائع حیات میں سے کسی پر، کسی شخص کا مالک بن کر بیٹھ جانا، اس نوعِ انسان کے خلاف جرمِ عظیم ہے جس کی زندگی کے قیام کا اسے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ظلم اور دھاندلی زمانہ قدیم سے رواج پاتی تو گا جائز چلی آ رہی تھی، قرآن کریم نے اس باطل تصور کو ذہن سے محو کرنے کے لئے بڑے محکم دلائل پیش کئے۔ اس نے خدا کو ماننے والوں سے کہا کہ تم جب "آسمانوں کے اوپر" خدا کے اقتدار و اختیار کو تسلیم کرتے ہو تو زمین پر اس کی الوہیت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ یاد رکھو! وہ جس طرح الٰہ السماء ہے، اسی طرح الٰہ الارض بھی ہے۔ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ

اِلٰہٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰہٌ (۴۳/۸۴) دوسری جگہ ہے۔ وَھُوَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ (۶/۳) اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ آسمان میں اور خدا تسلیم کرنا اور ارض میں کوئی دوسرا خدا، کھلا ہوا شرک ہے (۱۶/۵۱-۵۲) سورۃ النحل میں ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ تم دو الٰہ اختیار نہ کرو۔ اللہ صرف ایک ہے اور وہ الٰہ وہ ہے لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۶/۵۲) سمٰوٰت اور ارض میں جو کچھ ہے سب اس کی ملکیت ہے۔ اس لئے تم انسانوں کو زمین کے رقبوں کا مالک قرار دے کر، انہیں خدا کا ہمسر نہ بناؤ۔ (۲/۲۲)۔ اس کا مالک وہی ہو سکتا ہے جس نے انہیں پیدا کیا اور تمام ذی حیات کے لئے ذریعۂ رزق بنایا ہے۔ (۲۹/۶۱-۶۲)

اس قدر واضح دلائل دینے کے بعد اس نے کہا کہ اے رسول! اب تم ان سے پوچھو کہ لِمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْھَا۔ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کی ملکیت ہے۔ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ لیکن اس کا جواب علم کی بارگاہ سے نہ دو۔ اس کے بعد ہے کہ اگر انہوں نے علم و بصیرت سے کام لیا تو سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ... انہیں کہنا پڑے گا کہ یہ سب خدا کی ملکیت ہیں۔ قُلْ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ (۲۳/۸۴-۸۵) ان سے کہو کہ جب تمہیں خود اس کا اعتراف ہے کہ یہ سب خدا کی ملک ہے تو پھر تم اس حقیقت کا سامنا کرنے سے کیوں گریز کرتے ہو کہ اس پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتی؟ اس حقیقت کو تسلیم کرو گے تو زمین کی پیداوار تمہارے لئے حلال و طیب ہو گی، ورنہ تم شیطان کے نقشِ قدم پہ چلتے جاؤ گے جس نے تمہارے کان میں پھونک دیا ہے کہ تم ذرائع رزق کے مالک بھی ہو سکتے ہو۔ (۲/۱۶۸)

معاوضہ محنت کا

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، روشنی، حرارت، ہوا، پانی اور زمین میں ایک فرق ہے۔ پہلی سب چیزیں اپنی استعمالی شکل میں از خود موجود ہیں لیکن خوراک کو زمین سے نکالنا پڑتا ہے جس میں محنت صرف ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پہ نہایت دلنشیں انداز میں واضح کر دیا کہ زمین کی پیداوار میں سے تم صرف اپنی محنت کے معاوضہ کے حقدار ہو۔ باقی "خدا کا حصہ" ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ تم کسی زمیندار سے بٹائی پہ زمین لے کر اس میں کاشت کرتے ہو تو اس میں سے ایک حصہ خود لے لیتے ہو اور دوسرا حصہ زمیندار کو دے دیتے ہو (جسے تم زمین کا مالک سمجھتے ہو) اسی قاعدے کے مطابق، زراعت میں اپنی محنت کا معاوضہ تم لے لو، اور حقِ مالکانہ خدا کو دے دو۔ سورۃ الواقعہ کی آیات ۶۳ تا ۷۴ میں اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ غور سے سنیئے۔ فرمایا۔

(اس مقصد کے لئے تم ذرا اس نظام پہ غور کرو جس کے مطابق تمہاری

پرورش اور نشوونما ہوتی ہے اور سوچو کہ کیا یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے وضع کردہ قوانین کے مطابق (مثلاً) تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو، تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر، اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا تم ایسا کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رُو سے ایسا ہوتا ہے۔

اس کے بعد کہا:۔

پھر کھیتی کے اُگنے کے بعد، اس کی حفاظت کون کرتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آجائے جس سے اُگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلہ ملنا تو ایک طرف، ہماری محنت اور بیج بھی بیگار میں گئے۔

اس کے بعد ہے:۔

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے؟

(یہ بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ پینے کے کام آ سکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے) ذرا سوچو کہ اگر بادلوں کا پانی (بارش) ویسے کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کر لیتے؟ حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج سے غور کر کے، صحیح نتیجے تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشوونما کے متعلق خدا کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے

اس کے آگے ہے۔

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے، اس سے اتنے کام لیتے ہو؟ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا — رگ رگ میں شعلے کو نہاں کر دینا — تمہاری کاریگری سے ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ:۔

(رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس تمام پروگرام میں

تمہارا حصّہ کسقدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر؟ تم کسی منہج سے بھی غور کرو، بہر حال اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہذا، اس کے ماحصل (سامانِ زیست) میں بھی تمہارا حصّہ بقدر تمہاری محنت کے ہو سکتا ہے۔ (تم پودے کے پودے کے مالک نہیں بن سکتے)۔ یہ تمام ذرائع پیداوار از خود موجود رہتے ہیں۔ یہ نہ تمہارے بنائے ہوئے ہیں، نہ خریدے ہوئے۔

یہ تمہیں اس حقیقت کی یاددہانی کراتے ہیں کہ انہیں خدا نے بھوکوں کیلئے سامانِ زندگی بنایا ہے۔

یعنی اس کاروبار میں، محنت تمہاری ہے اور ذرائع پیداوار ہمارے۔ لہذا، تم اس میں سے اپنی محنت کا معاوضہ، سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو اور ہمارا حصّہ ہمیں دے دو۔" سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصّہ آپ کو کسطرح پہنچائیں؟ جواب دیا کہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ۔ یہ ان تک پہنچا دو جو اپنے لئے سامان پرورش حاصل کرنے کے قابل نہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔ اسی حقیقت کو (۶۷/۲۱ - ۶۷/۳۰ - ۸۰/۲۴-۳۲) میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی ان تصریحات کی روشنی میں، اسلامی نظام نے عملی قدم اٹھایا۔ اور جو لوگ "بے حد و نہایت" زمین کے رقبوں کے مالک بنے بیٹھے تھے، ان کی ملکیت کی تحدید (حد بندی) کرنی شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے معیار یہی ہو گا کہ ایک شخص کے پاس اسی قدر رقبہ اراضی رہے جس کی پیداوار اس کی اور اس کے اہل و عیال کی پرورش کے لئے کافی ہو۔ اس طرح اس نے زمین پر ذاتی ملکیت ختم کرنے کے عملی پروگرام کی ابتداء کر دی۔

رقبوں کی تحدید

سورۃ الرعد میں ہے کہ داعی انقلاب حضور نبی اکرمؐ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس انقلاب کے لئے میں نے اپنی تمام عمر صرف کر دی ہے، کیا اس کی تکمیل میری زندگی میں ہو جائے گی یا نہیں؟ اس کے جواب میں کہا کہ تم اس کی فکر نہ کرو کہ اس کی تکمیل تمہاری موجودگی میں ہو گی یا تمہاری وفات کے بعد، تم اس پیغام کو عام کرتے جاؤ۔ یہ مکمل ہو کر رہے گا۔ خواہ تمہاری زندگی میں اور خواہ اس کے بعد، تم دیکھتے نہیں کہ:

ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سکیڑتے اور سمیٹتے (کم کرتے) چلے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ ان پر ان کی ملکیت ختم ہو گی، اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے فیصلے کو لوٹا نہیں سکتی۔ ہم بہت

جلد حساب کرنے والے ہیں۔ (۱۳/۴۱)

سورۃ الانبیاء میں کہا ہے کہ انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو زمین متاعِ حیات حاصل کرنے کے لئے ملی تھی۔ اس پر زمانہ گذر گیا تو انہوں نے اس پر قبضہ مخالفانہ جما لیا۔ اب ہم آہستہ آہستہ اسے ان کے ہاتھوں سے نکال رہے ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکیں گے۔ (۲۱/۴۴) زمینداری کی بنا پر جو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، اس کے ختم ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔

یوں اس دوسری منزل میں اس نظام کے عملاً قیام کی ابتدا کر دی

تیسری منزل

(تکمیلِ کار)

اب ہم اس پروگرام کی تیسری (اور آخری) منزل میں پہنچ رہے ہیں۔ اب اسلامی مملکت وجود میں آگئی ہے اور خدا نے ربوبیتِ عالمین (یعنی تمام افراد کو سامانِ نشوونما دینے) کا جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کی ذمہ داری اس مملکت نے اپنے سر پر لے لی ہے۔ یہی اس مملکت کے وجود کی وجۂ جواز تھی۔ سورۃ الحج میں ہے۔

اسلامی مملکت کی وجۂ جواز

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ..... (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے۔

یہ آیۂ جلیلہ اسلامی مملکت کی وجۂ جواز اور اس کی ذمہ داری کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ میں اس وقت "اقامتِ صلوٰۃ" کی تشریح میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ وہ ایک جداگانہ موضوع ہے[1]۔ اپنے آپ کو ایتائے زکوٰۃ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں کہ یہی ہمارا موضوع زیرِ نظر ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں "زکوٰۃ دینا"۔ یعنی قرآن نے کہا یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یا ذمہ داری "زکوٰۃ دینا" ہے۔ یہ نکتہ بڑا توجہ طلب ہے۔

---

[1] اس موضوع پر اسی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہو رہا ہے۔

ہمارے ہاں زکوٰۃ سے مراد لی جاتی ہے وہ رقم جو ایک مالدار ایک خاص شرح کے مطابق، اپنی دولت سے نکالتا ہے اور حکومت کا فریضہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اس رقم کو وصول کرکے اسے متعین مصارف کے مطابق خرچ کرے۔ یعنی ہمارے مروجہ مفہوم کی رُو سے، حکومت کا فریضہ لوگوں سے زکوٰۃ لینا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ "زکوٰۃ دینا" ہے۔ زکوٰۃ کا یہ مفہوم کہ وہ ایک متعینہ رقم ہے جسے مالدار (صاحبِ نصاب) اپنی دولت سے نکالتا ہے، قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آیا۔ نہ ہی اس میں "زکوٰۃ کے مصارف" کا کوئی ذکر ہے۔ (جنہیں مصارفِ زکوٰۃ کہا جاتا ہے وہ صدقات کے مصارف ہیں نہ کہ زکوٰۃ کے۔ دیکھئے ۹/۶۰) زکوٰۃ کے معنی ہیں "نشوونما"۔ لہٰذا، "ایتائے زکوٰۃ" کے معنی ہوں گے سامانِ نشوونما عطا کرنا۔ اس سے بات صاف ہوگئی۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے اور اس طرح ربوبیت عالمینی اور اور رزاقیت کی وہ ذمہ داری، جسے خدا نے اپنے اوپر لیا تھا، پوری کرے۔ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو کسطرح پورا کریگی، اس کی تفصیل قرآن کریم میں بڑی شرح وبسط سے دی گئی ہے۔ اسی کا نام "قرآن کا معاشی نظام" ہے۔

خدا سے معاہدہ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جو شخص اسلامی سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے (یعنی مسلمان ہوتا ہے) اسے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (۹/۱۱۱)

یعنی اس سوسائٹی کا ممبر بننے والا، اپنا مال اور اپنی جان، خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے اور اس کے بدلے میں خدا اسے جنّت عطا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عملاً یہ معاملہ (TRANSACTION) اسلامی مملکت کے ساتھ ہوتا ہے (۴۸/۱۰) اس طرح، ایک عبد مومن کا جان ومال، انفرادی ملکیت کے بجائے، اسلامی نظام کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اس کے عوض اسے اس دنیا میں بھی جنتی زندگی مل جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنّت، جس کا وعدہ خدا نے بے شمار مقامات پر کر رکھا ہے۔ لہٰذا، اسلامی نظام میں، مال پر انفرادی ملکیت کسی فرد کی نہیں رہتی وہ "خدا کا مال" ہو جاتا ہے۔ (۲۴/۳۳)

اختلافِ صلاحیّت قرآن اسے تسلیم کرتا ہے کہ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مختلف بھی اور کم وبیش بھی۔ میں اس وقت اس موضوع کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ صلاحیتوں کا یہ فرق کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس فرق کو کسطرح کم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میں اس امرِ واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے

کہ مختلف افراد کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے، اس باب میں قرآنی نقطہ نگاہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ قرآن کہتا ہے کہ صلاحیتوں کے اختلاف سے معاشرہ کے مختلف کام بآسانی سرانجام پاتے رہتے ہیں۔ (۴۳/۳۲) لیکن (وہ کہتا ہے کہ) اس اختلاف کو صرف اسی حد تک رکھو۔ اس سے معاشی ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ چنانچہ اس نے سورۃ النحل میں واضح الفاظ میں کہا کہ "اکتسابِ رزق کے سلسلہ میں، مختلف افراد میں صلاحیتوں کا فرق ہوتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کا مطلب یہ نہیں کہ جو لوگ زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اپنی کمائی کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے دبا کر بیٹھ جائیں۔ انہیں چاہیئے کہ اس فاضلہ کمائی کو اپنے ان ماتحتوں کی طرف لوٹا دیں جن کے تعاون و اشتراک سے کمائی میں اسقدر اضافہ ہوا ہے۔ لوگ، یہ کہہ کر ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ واہ! اس سے تو اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہو جائیں گے؟ ایسا کہنے والے اس فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ انہیں جو زیادہ صلاحیت حاصل ہے۔ وہ ان کی ذاتی پیدا کردہ ہے، یہ غلط ہے۔ بنیادی طور پر یہ صلاحیت ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں، خدا کی عطا کردہ نعمت ہے جو انہیں بلا مزد و معاوضہ ملی تھی۔ (۱۶/۷۱ - ۱۶/۵۳) اس نے کہا کہ قارون (جسے قرآن نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے)

قارونیت بھی اسی فریب میں مبتلا تھا جب اس نے کہا تھا کہ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸) میرا مال و دولت، میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ میں اسے دوسروں کو کیوں دے دوں؟ قرآن کہتا ہے کہ یہی ذہنیت سارے فتنہ کی جڑ اور دنیا میں فساد برپا کرنے کی موجب ہے۔ (۳۹/۴۹) دوسرے مقام پر وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے سے جب کہا جاتا ہے کہ کیا تمہیں اس کا احساس اور خیال نہیں کہ تم نے ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے جہاں اس کی عطا کردہ نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا (۱۰۲/۸) تو (ہر چند اسے اس قسم کی بازپرس پر یقین نہیں ہوتا لیکن وہ خود فریبی یا فریب دہی کے لئے) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس مال و دولت میں سے جو دو چار پیسے خیر خیرات کے طور پر "خدا واسطے" دے دیتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ اس کے عوض مجھے اس دنیا میں بھی اسی طرح خوشگواریاں حاصل ہو جائیں گی جس طرح اس دنیا میں حاصل ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسا سمجھنا کفر ہے اور اس کا نتیجہ سخت عذاب۔ (۴۱/۵۰)

قُلِ الْعَفْوَ یہ سب کچھ واضح کر دینے کے بعد، قرآن کریم نے وہ فیصلہ سنا دیا جس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے اور قطعی طور پر طے ہو گیا۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ انہیں

حتمی طور پر بتا دیا جائے کہ ان کی کمائی میں ان کا اپنا حق کس قدر ہے۔ اور دوسروں کا کسقدر۔ کہا گیا کہ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ اس میں تمہارا حق صرف اتنا ہے جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب کا سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا موقعہ آجائے کہ دوسرے کی ضرورت، تمہاری ضرورت سے زیادہ شدید ہے، تو تم اپنی ضرورت پر اس کی ضرورت کو ترجیح دو۔ (۵۹/۹)

اس (قل العفو کے) فیصلہ نے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے طے کر کے رکھ دیا۔ اس سے کسی کے پاس فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) نہ رہی۔ اور جب کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہی تو معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی تمام خرابیوں اور تباہیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ قرض خواہ اور مقروض۔ مالک مکان اور کرایہ دار۔ زمیندار اور کاشتکار۔ کارخانہ دار اور مزدور۔ غریب اور امیر کا تفاوت ختم ہو گیا۔ اور یوں

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ۔۔۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے ۔۔۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

زمین کا مسئلہ

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام افرادِ انسانیہ (بلکہ تمام ذی حیات) کے لئے سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ ہے (۵۵/۱۰) اس لئے ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ یہ ذریعہ رزق، تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے۔ سَوَاءً لِّلسَّائِلِيْنَ (۴۱/۱۰) یہ تمام نوعِ انسان کے لئے، خدا کی طرف سے عطیہ ہے۔ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰) اور جو چیز تمام انسانوں کو بطور عطیہ ملی ہو، کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اس پر پھاٹک لگا کر "میری اور تیری" کی حدبندیاں قائم کرنے لگ جائے۔ جو لوگ، رزق کے ان چشموں کو جنہیں، آبِ رواں کی طرح بہتے رہنا چاہیئے تاکہ ہر ضرورتمند اپنی ضروریات بلا روک ٹوک پوری کر سکے، اپنے لئے روک لیتے ہیں، وہ دیندار ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود عملاً دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان کی نمازیں لوٹا کر ان کے منہ پر مار دی جاتی ہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن نے اس حقیقت کو کسقدر فکر انگیز انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ۔ یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے

اور مسکین کی روٹی کا نہ خود انتظام کرتا ہے نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میں جو نماز پڑھ لیتا ہوں تو اس سے دین کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی فریب خوردگی ہے۔ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ۔ ایسے نمازیوں کے لئے انجام کار تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر اور اس کی غرض و غایت سے غافل رہتے ہیں۔ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نماز کے محسوس ومرئی ارکان کی ادائیگی کا نام صلوٰۃ ہے، وہ انہیں ادا کر لیتے ہیں۔ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ۔ (۱۰۷/۷-۱) اور رزق کے آبِ رواں کو روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر یہ تکذیبِ دین نہیں تو اور کیا ہے؟

ارض اللہ

زمین کی اس پوزیشن کو قرآنِ کریم نے، قومِ ثمود کی تاریخی شہادت کی روشنی میں اس طرح واضح کر دیا کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ رہا۔ اس نے کہا کہ قوم ثمود کی معیشت کا مدار گلہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ ان کے گرد و نواح کھلی چراگاہیں اور پانی کے چشمے تھے لیکن قوم کے سرداروں نے ان پر اپنا ذاتی قبضہ جما رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے مویشی بھوکے اور پیاسے رہ جاتے تھے۔ ان کی طرف حضرت صالحؑ پیامبرِ انقلاب بن کر آئے۔ انہوں نے سرفرازانِ قوم کے اس غصب و نہب کے خلاف آواز بلند کی۔ ان سرداروں نے ان سے پوچھا کہ آپ بالآخر چاہتے کیا ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ھٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ لَکُمۡ اٰیَۃً فَذَرُوۡھَا تَاۡکُلۡ فِیۡۤ اَرۡضِ اللّٰہِ۔ (۷/۷۳) یہ زمین خدا کی ہے۔ نہ تمہاری ہے نہ میری۔ اور یہ مویشی بھی اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لئے ان مویشیوں کو آزادی ہونی چاہیئے کہ یہ اپنے خدا کی زمین سے چریں چگیں۔ تمہیں اس کا حق کیسے پہنچتا ہے کہ تم ارض اللہ (خدا کی زمین) پر اس طرح حد بندیاں قائم کر دو کہ اس کی مخلوق اس کی زمین میں تمہاری عائد کردہ حدود سے آگے نہ جا سکے۔ (۷/۷۳، ۱۱/۶۴)[1] انہوں نے کہا کہ اس کا عملی طریق کیا ہونا چاہیئے۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ یہ بڑی آسان بات ہے۔ لَہَا شِرۡبٌ وَّلَکُمۡ شِرۡبُ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ۔ (۲۶/۱۵۵ - ۹۱/۱۳)۔ تم جانوروں کی باریاں مقرر کر دو۔ ہر جانور، بلا تخصیص اس کے کہ وہ کس کا جانور ہے، اپنی اپنی باری پر پانی پی لے۔ "باریاں مقرر کرنے" کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانے میں ہر ایک کا اشتراک ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ارض اللہ کے معنی کیا ہیں؟ یہ کوئی ذہنی تصور یا نظری

---

[1] سرزمینِ مدین میں اسی قسم کا واقعہ حضرت موسٰی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ جہاں صاحبِ اقتدار سرداروں کے چرواہے کمزور و ناتواں لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی نہیں پینے دیتے تھے۔ (۲۸/۲۳)

عقیدہ نہیں۔ یہ قرآن کے معاشی نظام کی عملی بنیاد ہے کہ زمین تمام نوعِ انسان کے لئے ذریعہ پرورش ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ ارض اللہ پر نظری عقیدہ رکھنا، اور عملاً اسے زید، بکر، عمر کی ملکیت میں دے دینا، قرآن کی رُو سے شرک ہے۔ کفر ہے۔ تکذیبِ دین ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

باطنِ الارض لِلّٰہ ظاہر است ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند، کافر است

اس نظام کی مخالفت

یہ ہے میری بصیرت کے مطابق، وہ معاشی نظام جسے قرآن کریم، نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے متعین کرتا ہے۔ آپ اس کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے، میں اسے خدا کی صفتِ رب العالمینی کی جہت سے، نظامِ ربوبیت[1] کہہ کر پکارا کرتا ہوں۔ یہی نظام، حضراتِ انبیاء کرامؑ نے، اپنے اپنے وقت میں، اپنی اپنی قوم کے سامنے پیش کیا لیکن مترفین کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ مترفین کے معنی، ہمارے دور کی اصطلاح میں، سرمایہ دار طبقہ (CAPITALISTS) ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ (۳۴/۳۴) ہم نے کسی قوم کی طرف کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا کہ اس نے یہ انقلابی پروگرام پیش کیا ہو، اور وہاں کے سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔ اس آیۂ جلیلہ سے دو باتیں واضح ہیں۔ یعنی

۱۔ حضراتِ انبیاء کرامؑ کی طرف سے جو نظام پیش کیا جاتا تھا، وہ نظامِ سرمایہ داری کی ضد تھا، اسی لئے سرمایہ دار طبقہ اس کی اس قدر مخالفت کرتا تھا۔ اور (۲) نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ خداوندی کی کشمکش، کچھ ہمارے دور کی خصوصیت نہیں جو یونہی ہنگامی طور پر پیدا ہو گئی ہے۔ ایسا شروع سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اگر کوئی جماعت اس نظامِ خداوندی کو لے کر کھڑی ہو جائے، اور اپنی تگ و تاز میں استقامت سے کام لے، تو یہ نظام کامیاب ہو کر رہتا ہے، خواہ سرمایہ دار قوتیں اس کی مخالفت میں کتنا ہی روپیہ کیوں نہ صرف کر دیں۔ سورہ انفال میں ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اس نظام کی مخالفت کرنے والے لوگ بے دریغ روپیہ خرچ کریں گے۔ کہ عوام کو خدا کی راہ کی طرف آنے سے روکیں۔ فَسَیُنْفِقُوْنَھَا۔ وہ اپنی ان مذموم کوششوں کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہاتے چلے جائیں گے۔

---

[1] پرویز صاحب کی کتاب کا نام بھی نظامِ ربوبیت ہے جو قرآن کے معاشی نظام پر جامع تصنیف ہے۔

ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً - لیکن ان کا یہ روپیہ کسی کام نہیں آئے گا ۔ انہیں افسوس ہوگا کہ انہوں نے خواہ مخواہ اتنا روپیہ ضائع کیا ۔ ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۔ (۸/۳۶) اس لئے کہ آخرالامر انہیں شکست ہوگی ۔ مذہبی پیشوا ۔ احبار و رہبان ۔ علماء و مشائخ ۔ اس روپے کو، جو خدا کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جانے کے لئے صرف کیا جائے گا، خوب مزے لے لے کر کھائیں گے ۔ لیکن اس کا کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں ہوگا ۔ (۹/۳۴) یہ مطففین ۔ جو اپنے واجبات تو پورے پورے وصول کر لیتے ہیں لیکن دوسروں کے حقوق کبھی ادا نہیں کرتے ، خدا کے راستے سے ، پرِ کاہ کی طرح ہٹا دیئے جائیں گے ۔ (۸۳/۱-۳) یہ اس وقت ہوگا ۔ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۳/۵) ۔ جب عام انسانیت ربوبیت عالمینی کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی ۔ اس وقت فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۔ اس قوم کی جڑ کٹ جائے گی جو سلب و نہب سے دوسروں کی محنت کی کمائی ہضم کر جاتی تھی ۔

یہ آیت کا آدھا ٹکڑا ہے ۔ اس کے دوسرے ٹکڑے کو سامنے لانے سے پہلے میں

الحمدللہ

اس عظیم حقیقت کو دہرا دوں کہ (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا) قرآن کریم نے اپنی دعوت کا آغاز الحمدللہ رب العالمین سے کیا تھا یعنی خدا اپنی ربوبیت عالمینی کی وجہ سے مستحق حمد و ستائش ہے ۔ لیکن انسانی دنیا میں اس کی یہ ربوبیت ، براہِ راست قائم نہیں ہوتی ۔ یہ انسانوں کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے اور یہ قائم نہیں ہو سکتی جب تک ان ظالموں کی جڑ نہ کٹ جائے جو اس کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل رہتے ہیں ۔ لہذا ، ظالم قوم کی جڑ کٹے بغیر ، نہ ربوبیت عالمینی وجود میں آسکتی ہے اور نہ ہی نوعِ انسان کی زبان پر بے ساختہ الحمدللہ رب العالمین آسکتا ہے ۔ اب پوری آیت کو دیکھئے ۔ فرمایا کہ

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۴۵)

اور یہی اس جماعت کی دعوت کا منتہیٰ تھا جو اس انقلاب کی داعی بن کر اٹھی تھی ۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۰/۱۰)

وحی کی راہ نمائی

لیکن یہ نظام ، وحی خداوندی کی راہ نمائی کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا ۔ یہ بات میں محض عقیدۃً نہیں کہہ رہا ، حقیقتاً کہہ رہا ہوں اور یہ غور سے سننے کے قابل ہے ۔ انسانی جسم کی طرح ، انسانی زندگی کے مسائل ایکدوسرے کے ساتھ اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ لہذا انسانی زندگی کے مسائل اسی صورت میں سلجھ سکتے ہیں کہ انسان کو تمام ——

(AS - A WHOLE) سامنے رکھا جائے۔ وحیٔ خداوندی نے، انسان کو تمامًا سامنے رکھ کر ایسی مستقل جامع اقدار دی ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے، انفرادی اور اجتماعی زندگی نکھرتی اور سنورتی چلی جاتی ہے۔ یوں کہئے کہ وحی خداوندی ایک مکمل فارمولا دیتی ہے جسے اگر تمام و کمال عمل میں لایا جائے تو متعینہ نتیجہ مرتب ہوگا۔ اس کے بعض اجزاء (بلکہ کوئی جزو بھی) چھوڑ دیا جائے تو مطلوبہ نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ یہی صورت انسان کے معاشی مسئلہ کی ہے۔ اسے اگر اس کی زندگی کے دیگر مسائل سے الگ رکھ کر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے اور الجھنیں پیدا ہوجائیں گی۔ آپ سوچئے کہ اگر قرآن کے اس معاشی نظام کو جس کا خاکہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے، اور جس کی رُو سے، ہر فرد کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ اپنے سر لے لیتا ہے، کسی ایسی سوسائٹی میں رائج کر دیا جائے جس کے افراد کام چور اور سست الوجود ہوں تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ یا اگر رزق کی فراوانیاں ایسی قوم کے ہاں آجائیں جو عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی ہو، تو سازوسامانِ زندگی کی یہی افراط ان کے ہاں کس قدر تباہی لے آئیگی! قرآن کی شہادت کے مطابق "کتنی ایسی بستیاں تباہ ہوگئیں جن میں رزق کی بڑی فراوانی تھی۔ یہ ہیں ان کے اجڑے ہوئے کاشانے جن میں ان کے بعد کوئی آباد نہ ہوا" (۲۸/۵۸)۔ لہٰذا، کوئی فلسفۂ زندگی، کوئی نظامِ حیات، جو انسان کو ایک طبیعی مشین تصور کر کے صرف اس کی روٹی کا مسئلہ حل کرنے کی فکر کرتا ہے، کاروانِ انسانیت کو کبھی اس کی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ قرآن، انسانی زندگی کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے جس کا ایک گوشہ یا پرتو، اس کا معاشی نظام ہے۔ اس کے اس کلی نظامِ حیات کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ انسانی زندگی، اس کے جسم کی طبیعی مشینری کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ، اس میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات یا نفس (HUMAN PERSONALITY) کہتے ہیں۔

انسانی ذات

اگر زندگی کی موجودہ سطح پر اس کی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے، تو وہ، مرنے کے بعد، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کی ذات کی نشوونما، وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک مستقل قدر یہ ہے کہ جس قدر کوئی شخص دوسروں کی پرورش اور نشوونما کے لئے دے گا، اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی (۹۲/۱۸) وہ جو اپنا مال اس لئے دیتا ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہوجائے۔ عصرِ حاضر کا

مشہور ماہر علم النفس (ERIC FROMM) اس حقیقت کو اپنے انداز میں بڑے خوبصورت پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کا مقصد (TO HAVE) نہیں بلکہ (TO BE) ہونا چاہیئے جسے قرآن، انسانی ذات کی نشوونما اور اس کا ارتکاز کہہ کر پکارتا ہے جو مال دینے سے حاصل ہوتا ہے یعنی (TO HAVE) کے برعکس زندگی کا مقصد قرار دینے سے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جوں جوں علم انسانی کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے، قرآنی دعاوی کی صداقت کس طرح نکھر کر سامنے آتی جاتی ہے (۴۱/۵۳) اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کا معاشی نظام قائم ہی ان لوگوں کے ہاتھوں ہوسکتا ہے جو وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار، اور مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان رکھتے ہوں۔ (اسے ایمان بالآخرت کہا جاتا ہے)۔

ایمان بالآخرۃ

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (یعنی دوسروں کو سامانِ نشوونما مہیا کرنے کا انصرام) وہی کرسکیں گے جو آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔ (۲۷/۳۱) اَلَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ۔ (۴۱/۷) آخرت کا منکر ایتائے زکوٰۃ کر ہی نہیں سکتا۔ بات بالکل واضح ہے جو شخص سمجھتا ہے کہ زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے۔ اسے خوشحالی سے گزار لینے والا کامیاب ہے، اس کے لئے وہ جذبۂ محرکہ کیا ہوسکتا ہے جس کی رُو سے وہ جان مار کر محنت کرے، اپنے لئے کم از کم رکھے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دے۔ اگر آپ کسی ہنگامی تحریک سے اس کے دل میں اس قسم کا جذبہ پیدا بھی کر دیں تو وہ۔ اگر ماند شبے ماند، شبِ دیگر نمی ماند۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ شعلۂ مستعجل، افسردہ ہو جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ سرمایہ داری پھر اس کا شعار بن جائے گی۔ سرمایہ پرست، آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب قرآن اس نظام کے نمائندہ قارون سے کہتا ہے کہ وہ اس انسانیت کُش نظامِ باطل کو چھوڑ دے، تو اس کی جگہ جس نظام کو تجویز کرتا ہے اس کی خصوصیت یہ بتاتا ہے۔ وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا۔ (۲۸/۷۷) اس مال و دولت میں سے، اس دنیا کی زندگی کے لئے حصہ بھی لے اور آخرت کا گھر بھی سنوار۔ اور یہی آرزو اس جماعت کے دل میں بھی مچلتی ہے جو قرآن کے معاشی نظام کی پیامبر بن کر اٹھتی ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً۔ (۲/۲۰۱) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا کی خوشگواریاں بھی عطا کر دے اور آخرت کی خوشگواریاں بھی۔ اور یہ چیز وحی کے عطا کردہ نظامِ حیات کی رُو سے حاصل ہوسکتی ہے جس کا

ایک پرتو قرآن کا معاشی نظام ہے۔ میں نے اپنی کتاب۔ نظامِ ربوبیت میں شرح وبسط سے بتایا ہے کہ کمیونزم یا سوشلزم کا معاشی نظام اس لئے کامیاب نہیں ہوا (اور نہ ہی کامیاب ہو سکتا ہے) کہ اس نظام کے علمبردار نہ وحی پر ایمان رکھتے ہیں نہ اُخروی حیات پر۔ ان کے ہاں وہ اساس نہیں ہے جس پر اس قدر عظیم نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ خود مسلمانوں کے ہاں بھی یہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکے گا کہ قوم کو وحی کی صداقت اور اُخروی زندگی کی حقیقت پر یقین محکم ہو۔ اس کے لئے پہلے قوم کے دل و دماغ میں بنیادی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنی ہوگی کیونکہ اُس وقت یہ ایمان رسمی الفاظ سے زیادہ کچھ نہیں

میں نے اپنی بصیرت کے مطابق، قرآن کے معاشی نظام کی وہ کڑیاں آپ کے سامنے رکھ دیں جن سے وہ اسے تدریجاً اس کے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک لے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کا قیام اسلامی مملکت ہی میں ممکن ہے (اسلامی مملکت وہ ہے جس کا جملہ کاروبار قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے) اسلامی مملکت جب اور جہاں بھی قائم ہو، اسے معاشرہ کی اس وقت کی حالت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اس نظام کی کون سی کڑی سے ابتداء کرے تاکہ اس کا قیام ممکن العمل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ سطحی جذبات پرست، ابتداء ہی سے اس کی آخری منزل اختیار کرنے پر زور دیں گے۔ اور یوں یہ حقیقت شاعری بن کر رہ جائے گی۔ دوسری طرف، وہ جس کی نگاہ قرآن کے کلی نظامِ حیات پر نہیں ہو گی، وہ اسے سرے سے ممکن العمل ہی نہیں سمجھے گا اور اسے (بزعمِ خویش) "فطرتِ انسانی" کے خلاف قرار دے گا۔ (جیسا کہ آج کل، نظامِ سرمایہ داری کے نقاب پوش حامی عام طور پر کہہ دیتے ہیں)۔ لہٰذا، اس نظام کے علمبرداروں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنا نصب العین تو اس کی آخری منزل قرار دیں لیکن اس تک پہنچنے کے لئے عملی قدم بتدریج اٹھائیں۔ اسی طریق سے، قرآن کا معاشی نظام صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا اور اسی طریق سے یہ اب قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں البتہ ایک فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ جب حضور نبی اکرمؐ نے اس انقلاب کی آواز بلند کی تھی تو آپ اکیلے مسلمان تھے۔ باقی سب غیر مسلم تھے۔ لیکن اب اسلامی مملکت کے باشندے مسلمان ہوں گے اس لئے ان سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن کا نظام ہے اور قرآن پر تم ایمان رکھتے ہو۔ اس لئے تمہیں اس کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ اس جہت سے ہمارا مرحلہ نسبتاً آسان ہوگا۔ لیکن شاید اسی جہت سے ہمارا مرحلہ زیادہ مشکل بھی ہو۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، رسول اللہؐ سب سے پہلے مسلمان تھے۔ اس کے بعد جتنے حضرات اسلام لائے، انہوں نے سمجھ سوچ کر اسلام قبول کیا۔ انہوں نے ذہن کے ایک ایک گوشے پر غور و فکر کیا۔ اس طرح وہ دل اور دماغ کے کامل یقین اور اطمینان کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے جب انہیں اس نظام کو قائم کرنے کے لئے کہا گیا تو یہ ان کے لئے نامانوس نظام نہیں تھا۔ ان کا اس کی نفع بخشیوں پر یقین اور اس کی محکمیت پر ایمان تھا۔ لیکن اب دنیا میں کوئی خطہ زمین بھی ایسا نہیں جہاں کے مسلمان اس طرح ایمان لائے ہوں۔ اس لئے اگر کوئی مملکت اس نظام کو اپنے ہاں رائج کرنا چاہے گی تو اسے ان مسلمانوں کو (قرآن کے الفاظ میں) از سرِ نو مسلمان کرنا ہوگا۔ (۴/۱۳۶) اس کے خلاف سرمایہ دار طبقہ اور مذہبی پیشوائیت محاذ قائم کرلیں گے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک اسلام وہ ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا، اور اس کے صحیح اسلام ہونے کی سند یہ ہے کہ وہ "اسلاف کا مسلک" ہے۔ مسلمانوں کی جو مملکت ان قوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگی۔ وہی اس نظام کو قائم کرسکے گی۔ لیکن اگر یہ اسے اپنے ہاں قائم نہیں کریں گے تو دنیا کی کوئی اور قوم اسے اختیار کرلے گی۔ قرآن تو پہلے ہی کہہ رہا ہے کہ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)۔ اگر تم اس سے اعراض برتو گے تو خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

اس مقام پر میں اس حقیقت کو ایک بار پھر واضح کردوں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ روس یا چین نے اس نظام کا آغاز کردیا ہے، تو یہ اگر مغالطہ آفرینی نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔ وہاں نہ اس نظام کو شروع کیا گیا ہے، نہ ہی یہ نظام چل سکتا ہے۔ مارکس نے کہا تھا کہ نوعِ انسانی کے معاشی مسئلہ کا حل اس بنیادی اصول میں ہے کہ "ہر ایک سے اسکی استعداد کے مطابق کام، اور اس کی ضروریات کے مطابق معاوضہ"۔ لیکن اسے وہ جذبہ محرکہ نہ مل سکا جس سے لوگ اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار ہوجائیں۔ اس لئے اس نے اس نظام (کمیونزم) کی جگہ سوشلزم کا نظام اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جس سے انسانیت، نظامِ سرمایہ داری سے بھی زیادہ سخت زنجیروں میں جکڑی گئی۔ جس نظریہ حیات میں نہ خدا پر ایمان ہو نہ مستقل اقدار پر، نہ انسانی ذات پر ایمان ہو نہ اُخروی زندگی پر، اس کی رُو سے نظامِ ربوبیت کس طرح کارفرما ہوسکتا ہے؟ انہیں اس کے لئے بنیاد ہی نہیں مل سکتی۔ اسی لئے اقبالؒ نے اس کے بارے میں کہا تھا۔

ایکہ می خواہی نظامِ عالمے   جستۂ او را اساسِ محکمے

نہ ہی یہ نظام "مروجہ اسلام" کی رُو سے قائم ہوسکتا ہے جو خود نظامِ سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے۔ یہ صرف قرآن کی رُو سے قائم ہوسکتا ہے

ثریا عندلیب

مال و دولت جمع کرنے والے متوجّہ ہوں!

قرآنِ کریم کی تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان پوری محنت سے رزقِ حلال حاصل کرے، روزی کمائے اور اس میں سے اپنی جائز ضروریات کے لئے اپنے پاس رکھے اور باقی مال و دولت نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے خرچ کرے۔ اپنی محنت کی کمائی کو اللہ کے قانون کے مطابق نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھنا اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ اسی کا نام تقویٰ ہے۔ اسی طرزِ عمل سے دنیا کی مشکلات بھی حل ہوتی ہیں اور اسی سے انسان کی مستقبل کی زندگی یعنی آخرت سنورتی ہے۔ سامانِ زیست کو اپنے لئے سمیٹے رکھنے اور دوسروں کی پرورش کے لئے نہ دینے سے معاشرہ بگاڑ و فساد کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ افرادِ معاشرہ مجموعی طور پر خوشگواریوں اور کامیابیوں سے محروم رہتے ہیں۔ تمام اشیائے کائنات، جن سے جمع کردہ مال و دولت ترکیب پاتے ہیں، اللہ کی ملکیت ہیں اور اس نے انہیں تمام انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے کسی ایک فرد کا یا مختلف افراد کا صرف اپنے (اپنے خاندان، اپنے بال بچوں) کے لئے سمیٹ کر رکھ لینا منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔ سورۂ معارج میں ہے کہ جہنم آوازیں دے کر بلائے گا اس شخص کو جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر تھیلی کا مُنہ کس کر باندھے رکھتا ہے۔ سورۂ الہمزہ میں یہ وعید دی گئی ہے کہ وہ شخص تباہ و برباد ہو کر رہے گا جس کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہو کہ دولت اکٹھی کرتا رہے اور پھر گنتا رہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہو گیا اور اب کتنا۔ یوں ننانوے کے پھیر میں گم رہے (۱۸/۷۰)۔ سورۂ توبہ میں آیا ہے کہ "جو لوگ سونے چاندی کے ڈھیر جمع کرتے رہتے ہیں اور انہیں نوعِ انسان کی بہبود کے لئے عام نہیں کرتے انہیں الم انگیز عذاب کی خبر سُنا دو، جس دن اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال جسے تم نے اپنے لئے جمع کر رکھا تھا اور دوسروں کو اس سے محروم کر رکھا تھا۔ سو اس جمع شدہ مال کا مزہ چکھو۔" ۹/۳۵

قرآنی نظام میں مال صرف انسان کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ ہے۔ دوسرے انسانوں کو محتاج بنا کر انہیں اپنا محکوم و مطیع بنا لینے کا ذریعہ نہیں۔ اسی لئے اس نظامِ خداوندی میں مال و دولت کو سمیٹ کر جمع کر رکھنے کی اجازت

نہیں ہے۔

اگر اپنی طلب کو اپنی جائز ضروریات پوری کرنے تک محدود رکھا جائے تو اس کی ایک حد ہوتی ہے لیکن جب جذبۂ تحرّک ایک دوسرے سے مال و دولت اور جاہ و منصب میں آگے نکل جانے کا ہو تو اس کی کوئی حد نہیں رہتی۔ یہ روش انسان کو انسانیت کی صحیح منزلِ مقصود سے یکسر غافل کر دیتی ہے۔ اس جذبہ کے ساتھ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جتنا حاصل کرتے جاؤ، اتنی ہی ہوس بڑھتی جاتی ہے حتّٰی کہ انسان قبر کے گڑھے تک پہنچ جاتا ہے (۱۰۲/۱-۲)۔ اگر عقل و فہم سے کام لے کر اس کو سمجھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ روش کس قدر تباہ کن ہے جو انسان کو جہنّم کی طرف لے جاتی ہے جسے وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے (۱۰۲/۳-۴-۵-۶)۔ جب ہوس انسان پر مسلط ہو جاتی ہے تو وہ حلال و حرام، جائز و ناجائز کی تمیز سے عاری ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کی کمائی چھینتا اور عیش کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے "تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ تمہیں پوچھنے والا کوئی نہیں۔ حساب کے وقت تم سے پوچھا جائے گا کہ اللہ کی نعمتوں کو، جنہیں اس نے تمام انسانوں کی پرورش کے لئے عطا کیا تھا، تم اسے محض اپنی ہوس کی تسکین کی خاطر سمیٹتے کیوں چلے جاتے تھے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے قصرِ تعیش کی رنگینیوں میں کس کس کے خون کی سُرخی شامل تھی۔ جو کچھ تم نے سمیٹا تھا وہ کس کی محنت کا ماحصل تھا اور تمہیں اسے غصب کر لینے کا کیا حق حاصل تھا (۱۰۲/۸، ۱۳/۲۱)۔ یہ مال مکافاتِ عمل سے نہیں بچا سکتا۔ مال پر گھمنڈ کرنے والے تباہی و بربادی کے جہنّم میں داخل ہوں گے اور اسی میں رہیں گے (۱۷/۵۸)۔ مال و دولت کے بل بوتے پر جو اپنے آپ کو دوسروں سے مستغنی سمجھ لیتا ہے وہ تباہیوں کے گڑھے میں گر جاتا ہے (۱۱/۹۲)۔ مال کو جمع کرنا اور اسے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کھُلا نہ رکھنا عذابِ جہنّم کو دعوت دینا ہے (۱۰۴/۳-۹)۔ جب مال کی محبت بلند انسانی اقدار کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے تو وہی مال فتنہ بن جاتا ہے (۸/۲۸)۔ مال و دولت نہ وجہِ عزّت و تکریم ہو سکتا ہے نہ کسی کام کی اہلیت کا بدل۔ انتخاب کا معیار صلاحیت ہونا چاہیئے مال و دولت نہیں (۲/۲۴۷)۔ دولت کے سہارے لیڈر بن جانے والے تباہی کا موجب ہوتے ہیں (۲۱/۷۱) قوموں کی تباہی اسی طرح ہوتی ہے (۱۰/۸۸، ۲۴/۳۵)۔ نیک عمل یہ ہے کہ مال کی محبت کے باوجود اسے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے صرف کیا جائے (۲/۱۷۷)۔ مال اس بات کی جانچ بنتا ہے کہ تم حق و صداقت کی راہ میں کس قدر ایثار کر سکتے ہو۔ اس کو ابتلا کہتے ہیں (۲/۱۵۵، ۳/۱۸۵)۔

نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے جدّوجہد میں مال کا نقصان بھی ہوتا ہے لیکن یہی اس مال کا صحیح مصرف ہے (۲/۱۵۵)۔ اجتماعی ضروریات کے وقت مال صرف کرنے سے دریغ کرنا اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنا ہے۔ مستقل اقدار کی حفاظت کے لئے جہاں مال کی ضرورت ہو مال خرچ کرو۔ جہاں جان دینے کی ضرورت پیش آجائے بلا توقف جان دے دو۔ یہی شعارِ زندگی، معیارِ خداوندی پر پورا اُترتا ہے اور اسی سے انسانیت کا حُسن نکھرتا ہے (۲/۱۹۵)۔ اگر انسان وحی کے تابع نہ چلے تو مال کی کثرت اسے حق کی مخالفت پر آمادہ کر دیتی ہے (۱۵-۱۲/۷۴)۔ مال و دولت نفرت کرنے کی چیز

نہیں لیکن اس کا مصرف جو قرآن میں متعین ہے وہ ہونا چاہیئے (۳/۱۳)۔ حق کی مخالفت میں صرف کردہ مال ضائع چلا جاتا ہے (۹۰/۶)۔ تم مال دے کر اپنے غلط اعمال کے نتائج سے نہیں بچ سکتے (۳/۹۱، ۳/۱۱۵)۔ لوگوں کے دکھاوے کے لئے نیک کاموں میں مال خرچ کرنا اس کے اجر کو ضائع کر دیتا ہے (۲/۲۶۴)۔ دینِ خداوندی مال پر بھی کنٹرول رکھتا ہے (۱۱/۸۷)۔ مومن کے مال میں محتاج اور ضرورت مند کا حق ہوتا ہے۔ وہ اسے بطور حق لے سکتے ہیں (اس لئے خیرات یا بھیک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) یہ مومن اپنی تنگ دلی کو کشادہ ظرفی سے بدل کر اس حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا مال صرف ان کے انفرادی مفاد کے لئے نہیں (۵۱/۱۹، ۷۰/۲۴)۔ مال اور جان سے جہاد ایسی تجارت ہے جس میں کبھی نقصان نہیں ہوتا (۱۱-۶۱/۱۰)۔ مال کی گردش اوپر کے طبقے میں محدود نہیں رہنی چاہیئے اسے (خون کی سارے جسم میں گردش کی طرح) پورے معاشرے میں یکساں طور پر گردش کرنا چاہیئے (۵۹/۷)۔ اپنے مال میں تصرف قوانینِ خداوندی کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ انسان اپنے مال کا مطلق مالک نہیں ہوتا بلکہ امین ہوتا ہے (۱۱/۸۷)۔ تمہارے بیوی بچے اور مال و دولت وہ کھٹالی ہیں جن سے تم کندن بن کر بھی نکل سکتے ہو اور راکھ کا ڈھیر بھی ہو سکتے ہو۔ کندن اس طرح بن سکتے ہو کہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرو کہ تمہاری محنت کا وہی معاوضہ حقیقی اور نتیجہ خیز ہے جو تمہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق ملے (۶۴/۱۵)۔ مال و دولت کی فراوانی سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ مقصودِ حیات حاصل ہو گیا مقصد اسے حاصل ہو گا جو اس کے ساتھ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے۔ (۶۰-۵۵/۲۳)۔

مال و دولت مقصود بالذات نہیں۔ مختلف مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ دولت کا اچھا یا برا ہونا اس مقصد کی نسبت سے متعین ہو گا جس کے حصول کے لئے اسے صرف کیا جائے گا۔ دولت کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں سے حاصل کرنا اور پھر اسے اللہ ہی کے متعین کردہ مقاصد کے حصول کے لئے صرف کرنا یہ ہے مومنین کا طریقِ زندگی۔

اعتذار

ہم بکمالِ ندامت اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ باوجود کوشش کے پرچے میں کتابت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً فروری ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں بعض جگہوں پر قرآنی آیات میں اعراب کی غلطیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ہم اس فروگذاشت کے لئے پہلے اپنے اللہ سے اور پھر اپنے قارئین سے بصد ادب معذرت خواہ ہیں۔ قرآنی آیات کے حوالہ جات درج ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ جس جگہ سقم پائیں گھر میں موجود قرآنِ مجید سے موازنہ کر کے اپنی کاپی درست فرمالیں۔ آئندہ کے لئے ہم ایسا طریق کار اختیار کر رہے ہیں جس میں کم از کم قرآنی آیات میں غلطی کا امکان نہیں ہو گا۔ اسی طرح صفحہ ۴۰ سطر ۱۹ میں "چاند" کی جگہ لفظ "خلا" لکھ لیجئے۔ شکریہ

ایڈیٹر

علامہ غلام احمد پرویزؒ

روزے کا مقصد

قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جہاں کسی بات کا حکم دیتا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس حکم کی غرض و غایت کیا ہے۔ اُس سے مقصود کیا ہے۔ اُس پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ روزے کے متعلق اُس نے کہا کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ اے جماعتِ مومنین! جس طرح اُن لوگوں پر جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں، روزہ فرض کیا گیا تھا، اُسی طرح تم پر بھی فرض کر دیا گیا ہے۔ یہ ہے روزے کا حکم۔ اس کے بعد ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (۲/۱۸۳) روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔ یہ ہے روزے کا مقصد۔

تقویٰ کا لفظ قرآنِ کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے جس کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ لیکن اگر اسے دورِ حاضر کی زبان میں سمجھنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد بلند ترین کیریکٹر۔ لہٰذا قرآنِ کریم نے کہا یہ ہے کہ تمہارے لئے روزے اس لئے ضروری قرار دیئے گئے ہیں کہ تم میں کیریکٹر پیدا ہو۔

سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص کو سخت بھوک لگی ہے۔ اس کے سامنے نہایت عمدہ کھانا رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ لپک کر لقمہ اٹھاتا ہے۔ اُسے مُنہ کے قریب لاتا ہے تو کوئی شخص اس کے کان میں کہتا ہے کہ اس کھانے میں زہر ملا ہوا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ اُس لقمہ کو مُنہ میں ڈالے گا یا کھانے کی پلیٹ اُٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ اُس کھانے کو کبھی نہیں کھائے گا۔ لیکن اس کے لئے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اُس نے اس کھانے سے پرہیز کر کے کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہیں گے کہ اس نے سمجھ سے کام لیا ہے۔ ایسے کھانے کو کوئی صاحبِ عقل و ہوش ہاتھ نہیں لگائے گا۔

اب اِسی مثال میں یوں سمجھئے کہ جب وہ شخص لقمہ مُنہ میں ڈالنے لگتا ہے تو اُسے بتایا جاتا ہے کہ یہ کھانا ناجائز کمائی کا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اس وقت بھی اس کا ردِّ عمل وہی ہو گا جو پہلے ہوا تھا؟ اگر وہ اب بھی اُس کھانے سے اُسی

طرح انکار کر دیتا ہے، جس طرح اُس نے زہر آلود کھانے سے انکار کر دیا تھا تو اسے کیریکٹر کہیں گے۔ یعنی جائز اور ناجائز میں تمیز کرنا، کیریکٹر کا پہلا زینہ ہے۔ جائز اور ناجائز میں تمیز کرنا صرف انسان کا خاصہ ہے۔ حیوان نہ اس قسم کی تمیز کر سکتا ہے نہ ہی اُسے اس کا کچھ احساس ہو سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ جائز اور ناجائز میں تمیز کرنا انسانیت کا تقاضا ہے۔

جہاں تک آدمی کی جسمانی زندگی کا تعلق ہے، اس میں اور دوسرے حیوانات میں کچھ فرق نہیں۔ دونوں کے لئے ایک جیسے طبیعی قوانین (PHYSICAL LAWS) مقرر ہیں۔ جن کے مطابق وہ زندہ رہتے اور بالآخر مر جاتے ہیں۔ یہ قوانین علم و عقل اور تجربات و مشاہدات کی رُو سے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کی انسانی زندگی طبیعی قوانین کے تابع نہیں۔ اس کے لئے اور قسم کے قوانین ہیں۔ یہ قوانین خدا کی طرف سے، وحی کے ذریعے ملتے ہیں۔ یہی وہ قوانین ہیں جن کی رُو سے جائز اور ناجائز میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ ان قوانین کو صحیح اور سچا سمجھنے کو ایمان کہتے ہیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ جو مثال پہلے بیان کی جا چکی ہے اُس میں جب اُس شخص نے زہر آلود کھانے سے انکار کر دیا تھا تو اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ بات بالکل واضح ہے۔ ایک طرف اس کی بھوک کا تقاضا تھا کہ کھانا کھا لیا جائے۔ دوسری طرف اس کی جان کی سلامتی کا تقاضا تھا کہ اُسے نہ کھایا جائے۔ چونکہ اس کے نزدیک، بھوک کے مقابلہ میں جان زیادہ قیمتی تھی اس لئے اس نے زیادہ قیمتی چیز کو بچانے کے لئے اُس سے کم قیمت کی چیز کو قربان کر دیا۔

جب اس سے کہا گیا کہ وہ کھانا ناجائز کمائی کا ہے تو اس وقت بھی اُس کے سامنے دو تقاضے تھے۔ ایک اس کے جسم کا تقاضا کہ بھوک مٹانے کے لئے کھا لیا جائے اور دوسرا اس کی انسانیت یا ایمان کا تقاضا کہ جائز اور ناجائز میں تمیز کی جائے۔ اگر اس کے نزدیک، جسم کے تقاضے کے مقابلے میں، ایمان کا تقاضا زیادہ قیمتی ہے تو وہ اُس کھانے سے پرہیز کرے گا۔ لیکن اگر وہ جسم کے تقاضے کو ایمان پر ترجیح دیتا ہے تو وہ اُس کھانے سے ہاتھ نہیں روکے گا۔ لہٰذا، کیریکٹر کے معنی یہ ہوئے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور ایمان کے تقاضے میں ٹکراؤ ہو جائے۔ ان میں (TIE) پڑ جائے، تو جو شخص ایمان کے تقاضے کو جسم کے تقاضے پر ترجیح دیتا ہے وہ بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔

روزہ انسان میں اس قسم کا کیریکٹر پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ روزہ رکھنے والا اپنے اوپر پابندی عائد کرتا ہے کہ وہ دن بھر کھانے پینے کی ان تمام چیزوں سے پرہیز کرے گا جو عام حالات میں اس کے لئے بالکل حلال اور طیب ہوتی ہیں۔ دن بھر اس کے جسم کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ کھانا کھائے اور پانی پئے لیکن وہ جسم کے اِس تقاضے پر ایمان کے تقاضے کو ترجیح دیتا ہے اور ان چیزوں کے قریب تک بھی نہیں جاتا۔ اس طرح روزہ انسان کو اس کا خوگر بنا دیتا ہے کہ وہ جسم کے تقاضوں پر ایمان کے تقاضوں کو ترجیح دے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ آپ کسی ایسے گول چکر کے قریب کھڑے ہو جایئے جہاں بہت سی سڑکیں ملتی ہوں اور دُور سے آتے ہوئے ایک سائیکل سوار کو دیکھئے۔ اگر اس چکر پر ٹریفک کا سپاہی کھڑا ہے تو سائیکل سوار

قانون کی پابندی کرتے ہوئے نہایت شریفانہ انداز سے بائیں طرف جائے گا۔ لیکن اگر وہاں سپاہی نہ ہو اور دائیں طرف کا راستہ ذرا قریب ہو تو وہ جھٹ سے دائیں طرف مڑ جائے گا اور تیزی سے سائیکل چلاتا ہوا فاتحانہ انداز سے آگے بڑھ جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم عام طور پر قانون کی پابندی اس وقت کرتے ہیں جب ہمیں ڈر ہو کہ ہم قانون شکنی سے پکڑے جائیں گے۔

اس کے برعکس آپ ذرا اس منظر کو سامنے لائیے کہ سخت گرمی کا موسم ہے۔ دوپہر کے وقت ایک روزہ دار ایک کمرہ میں تنہا بیٹھا ہے۔ پیاس کی شدت سے وہ بیتاب ہو رہا ہے۔ سامنے ٹھنڈے پانی کی صراحی رکھی ہے۔ لیکن وہ ایک گھونٹ پانی نہیں پیتا، حالانکہ اُس وقت اُسے کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا۔ اسے کیریکٹر کہتے ہیں۔ روزہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ جو شخص اپنے ایمان کے تقاضے کے ماتحت، حلال اور طیب چیزوں سے پرہیز کرتا ہے وہ حرام اور ناجائز چیزوں کو کس طرح ہاتھ لگا سکتا ہے، خواہ کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جہاں روزے کے احکام ختم ہوتے ہیں اس کے فوری بعد کہا گیا ہے کہ

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۱۸۸)

اور دیکھو! ایسا نہ کرو کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے کھاؤ اور نہ ایسا کرو کہ مال و دولت کو حکام تک پہنچاؤ تاکہ وہ اس بات کا ذریعہ بن جائے کہ تم دوسروں کے مال کا کچھ حصہ ناحق حاصل کر لو حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ تمہارا نہیں ہے۔

لہٰذا، روزے سے مقصود یہ ہے کہ انسان اس بات کا عادی ہو جائے کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں جائز اور ناجائز کی تمیز کرے۔ جائز کو اختیار کرے اور ناجائز سے پرہیز کرے۔ خواہ اُسے کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

ایک ستون اور گر گیا

بزم سید حسن (دینہ) کے نمائندہ سید محمد حسین شاہ صاحب پچھلے دنوں جنرل کونسل کے اجلاس میں تشریف لائے تو خاصے کمزور نظر آ رہے تھے لیکن باایں ہمہ عزائم میں پہلے کی سی بلندی۔ میں نے کہا آپ نے کیوں تکلیف کی اپنی علالت کی اطلاع کر دی ہوتی۔ کہنے لگے زندگی کا کیا بھروسہ ہے ہو سکتا ہے یہ میری آخری حاضری ہو۔ اور وہی ہوا۔ موصوف کچھ دن بیمار رہ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور تحریک ایک مخلص کارکن کی رفاقت سے محروم ہو گئی۔ قدیم رفقاء کی جدائی بڑی جگر پاش ہوا کرتی ہے اور پھر شاہ صاحب جو اپنی ذات میں ایک مکمل شخصیت تھے۔ بلند نگاہ شائستہ ذوق، پاکیزہ صورت، انتہائی کم گو، کہاں بھول سکتے ہیں۔ ہماری دُعا ہے کہ قرآن کا محافظ قرآن کے اس شیدائی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اشکبار ناظمِ ادارہ۔

محمد عمر دراز

لمحۂ فکریہ

اللہ کا ارشاد ہے کہ "وہ کبھی ایسا نہیں ہونے دیگا کہ کفار مومنین پر غالب آ جائیں

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ آج مسلمان، خواہ اپنوں کی مملکت میں بس رہے ہوں یا غیروں کی، دنیا میں جہاں جہاں بھی ہیں، کفار کے دست نگر بن کر اور ان کی آراء اور احکام کے تابع زندگی گذار رہے ہیں۔ یورپین ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ان ممالک کے آئین و دساتیر کے مطابق نہ چلیں، لہٰذا وہ تو مرفوع القلم ہیں اس لحاظ سے ایسے ممالک میں بسنے والے مسلمان بھی، جہاں کے اربابِ بست و کشاد اور اعیانِ حکومت و اقتدار خیر سے، مسلمان ہیں اور انہیں خود بھی مسلمان ہونے کا دعویٰ ہے، غیروں ہی کے رحم و کرم پر جی رہے ہیں۔

اپنی اس حالتِ زار اور کس مپرسی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ سوال ذہن میں اُٹھتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ ہم مسلمان یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ ہم مومن ہیں، اللہ کے احکام ماننے والی قوم ہیں۔ بالخصوص ہمارے علمائے کرام کی زبان نہیں تھکتی یہ دُہراتے ہوئے کہ ہم اللہ کے خاص بندے ہیں اور اپنی زندگیاں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی بجا آوری میں گذارتے ہیں، غرضیکہ ان کے مومن ہونے میں (بقول اُن کے) ذرا بھی شک و شُبہ کی گنجائش نہیں۔ ان کا رہن سہن، طرزِ بود و ماند، لباس، وضع قطع، یعنی اُن کی زندگی کا ہر گوشہ، ان کی اپنی میزان میں مومنین ہی کی زندگی کا شعار ہے۔

تو پھر ایسا کیوں ہے کہ ہم کفار کے دستِ نگر اور تابع فرمان ہیں۔ اس حقیقت سے کسی کو بھی مجالِ انکار نہیں کہ کوئی ملک بھی (بالخصوص مسلمان ممالک) بالشت بھر بھی ان کی اسکیموں اور مقرر کردہ خطوط سے روگردانی یا انحراف کرنے کی جراٴت نہیں کر سکتا۔ جو ایسا کرتا ہے اُسے یہ ممالک عراق یا لیبیا بنا دیتے ہیں۔

اسی سوچ میں قرآنِ کریم کی یہ آیۂ جلیلہ سامنے آ گئی کہ "اللہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا کہ کفار، مومنین پر غالب آ جائیں"۔ (۴/۱۴۰)

بات اور اُلجھ گئی۔ اللہ بھی حق ہے اور اس کا ارشاد بھی برحق، پھر اس صورت حال سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت کفار، مومن ہونے کا دعوےٰ کرنے والوں پر غالب ہیں، معاشی طور پر بھی، سیاسی جہت سے بھی اور قوت کے اعتبار سے بھی۔ ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ اللہ کی اس بات میں کہاں تک صداقت ہے کہ "وہ (جب تک اللہ ہے) ایسا

تم ہی سب سے بلند و برتر ہو گے" (۳/۱۳۸)۔ اب بات کچھ کچھ صاف ہونے لگی ہے۔ یاد آیا کہ علامہ اقبالؒ نے بھی تو یہ کہا ہے:۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے — غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے

سوچ کا رُخ فوراً اس طرف گیا کہ ہمارے سامنے جو مثلث ہے، اس کا صرف ایک گوشہ تحقیق طلب ہے یعنی اگر تم مومن بن جاؤ تو .... ایک ثانیہ کے لئے بھی کوئی مسلمان، قرآن میں بیان کردہ کسی حقیقت کے متعلق شک و شبہ نہیں کر سکتا، تو پھر تو فیصلہ طلب بات یہی رہ جاتی ہے کہ کیا ہم فی الحقیقت مومن ہیں یا اپنے آپ کو فریبِ نفس دے کر (کہ ہم مومن ہیں) اللہ کے اس ارشاد کی تکذیب کر رہے ہیں۔

اب نگاہ کا رُخ اِس طرف آگیا کہ قرآنِ کریم ہی سے پوچھا جائے کہ اس کی میزان میں مومن کون ہے؟ کیونکہ ہمارے تصور کے مومن تو اقوامِ عالم میں پست ترین حالت میں ہیں۔ یہ خیال ذہن میں آنا تھا کہ یہ آیاتِ قرآنیہ کوندے کی لپک کی طرح سامنے آگئیں کہ:

- "جو بھی اُس کے مطابق فیصلے نہیں کرتے جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو وہی لوگ تو کافر ہیں۔" (۵/۴۴)
- "جو بھی اُس کے مطابق فیصلے نہیں کرتے جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو وہی لوگ تو ظالم ہیں۔" (۵/۴۵)
- "جو بھی اُس کے مطابق فیصلے نہیں کرتے جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو وہی لوگ تو فاسق ہیں۔" (۵/۴۷)

کبھی نہیں ہونے دے گا کہ کفار، مومنوں پر غالب آجائیں"، تو قرآن کریم کی یہ آیۂ جمیلہ سامنے آگئی کہ "اللہ سے بڑھ کر، قول کا سچا کون ہو سکتا ہے؟" (۴/۱۲۲) اور ساتھ ہی یہ آیۂ جلیلہ بھی کہ

"ہم پر واجب ہے کہ ہم مومنین کی مدد کریں" (۳۰/۴۷)

تو سوچا کہ اللہ تعالیٰ بھی خوب کہتے ہیں کہ ہم کبھی بھی کفار کو مومنین پر غالب نہیں آنے دیں گے، جو بات بظاہر (اس زمانہ میں درست ثابت نہیں ہو رہی)۔ پھر کہتے ہیں کہ ہماری بات سے زیادہ سچی بات کسی کی نہیں ہو سکتی۔ مزید فرماتے ہیں کہ ہم پر واجب ہے کہ ہم مومنین کی مدد کریں اور اس سب کے باوجود، مومنین کی مدد کر کے اپنا فریضہ بھی ادا نہیں کر رہے یا پھر ہماری حالتِ زار اس پر عیاں نہیں؟ لیکن یہ خیال آتے ہی قرآنِ کریم کا یہ مقام سامنے آگیا جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ، ظاہر اعمال تو ایک طرف، دل میں گزرنے والے خیالات تک کا علم رکھتے ہیں (۴۰/۱۹) تو پھر بات کیا ہے؟ اس کشمکش و پیچ میں، خیالات کی پرواز اس قرآنی آیت تک لے آئی کہ" اگر تم مومن بن جاؤ، تو

بات اور بھی صاف ہوگئی اور ذہن نے مزید پوچھا کہ پھر مومن کی زندگی کا شعار کیا ہونا چاہیئے۔ قرآنِ کریم کے مطابق سب سے پہلے مسلم اور مومن، حضور نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ سامنے لانا پڑا۔ حضورؐ سے اللہ کا ارشاد ہے کہ "ان لوگوں کے (اختلافی امور میں) ہماری طرف سے نازل کردہ (ضابطہ) کے مطابق فیصلے کیجئے" (۵/۴۸)۔ اور حضورؐ کی لسانِ مبارک سے آپ کی سنت (یعنی وہ طریقہ جس پر آپ نے ہمیشہ ہمیشہ عمل کیا) یہ بتائی گئی ہے کہ "میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے" (۶/۹) اور حضورؐ ہی سے یہ اعلان کروایا گیا ہے کہ "ان سے کہہ دیجئے کہ سب سے بڑی شہادت کون سی ہو سکتی ہے؟ کہیئے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ شاہد ہے کہ مجھ پر یہ قرآن وحی کیا جاتا ہے، تاکہ میں تمہیں اور اُن لوگوں کو جن تک یہ قرآن پہنچے، غلط روش زندگی کے عواقب سے آگاہ کروں" (۶/۱۹)۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی وجۂ تقویتِ قلب ہوا کہ "رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی" (۵۵/۱-۲)۔

اب بات ٹھہر کر سامنے آگئی کہ ہماری پستی و زبوں حالی کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے معاملات میں فیصلے "ما انزل اللہ" یعنی اللہ کی طرف سے نازل کردہ (ضابطہ) کے مطابق نہیں کرتے، اس لئے ہم مومن ہی نہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن مومنین کو یہ ضمانت بہم پہنچائی ہے کہ وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا کہ کفار ان پر غالب آجائیں تو ایسا ہرگز ہرگز ہمارے لئے نہیں کہا گیا۔

اس بات سے پھر اُلجھاؤ پیدا ہوا کہ ہم ایمان رکھنے کا دعوےٰ بھی کرتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں، حتی المقدور زکوٰۃ بھی دیتے ہیں (ہر سال بنکوں میں کروڑوں روپوں کی زکوٰۃ کی کٹوتی ہوتی ہے)، ہم میں سے بہت ساروں نے حج بھی کیا ہوا ہے، بظاہر ہم قرآنِ کریم کو بھی مانتے ہیں اور اسے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں تو پھر ہم میں کون سی کمی ہے جس کی بنا پر ہم اللہ تعالیٰ کی اس ضمانت کے ذیل میں نہیں آتے۔ یہ خیالات مزید گہرائی نہ پکڑ سکے کہ روزِ محشر، حضور نبی اکرمؐ کی اپنے ربّ کے حضور یہ شکایت قرآن سے سامنے آگئی کہ اس دن "رسولؐ یہ کہے گا کہ میرے ربّ یہ ہے میری وہ قوم جس نے قرآن کو مہجور بنا رکھا تھا" (۲۵/۳۰)۔ اب تلاش ہوئی کہ مہجور کیا ہوتا ہے؟ ---------- لغات القرآن سے اس کا جواب یہ ملا:۔

"آپ نے دیکھا ہوگا کہ سرکش اور تند رُو جانوروں کو قابو میں رکھنے کے لئے، ان کے پاؤں سے ایک رسّی باندھ دی جاتی ہے، جس کا دوسرا سرا اُن کے گلے میں یا عام طور پر ایک سینگ کے ساتھ بندھا ہوتا ہے۔ اس رسّی کی لمبائی اتنی رکھی جاتی ہے کہ جانور کا سر بہت جُھکا رہتا ہے۔ وہ اس طرح پورا جکڑا جاتا ہے کہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ عرب گھوڑوں اور اُونٹوں کو اس طرح باندھ دیا کرتے تھے۔ اس طرح بندھے ہوئے جانور کو "مہجور" کہا جاتا تھا اور جس رسّی سے اُسے اِس طرح باندھا جاتا تھا اُسے "الہجار" کہتے تھے۔"

اب بات سمجھ میں آئی کہ ہمارے رسولؐ، اللہ سے کیا شکایت کریں گے! رسولؐ، یومِ حشر اللہ سے کہیں گے

کہ مسلمانوں نے قرآنِ کریم کو (جسے تو نے اس لئے نازل فرمایا تھا کہ یہ اس سے اپنے باہمی اختلافات کے فیصلے کرائیں) اپنے خودساختہ اعتقادات، خیالات، رسومات، روایات، قوانین اور تفاسیر وغیرہ کی رسیوں سے جکڑ کر 'مہجور' بنا رکھا تھا جس سے وہ ایک قدم بھی آزادی سے نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ انہوں نے قرآنِ کریم کو چھوڑا نہیں تھا سینوں سے لگا رکھا تھا لیکن اس کی ساری آزادیاں سلب کر رکھی تھیں اور اسے اتنا ہی چلنے کی اجازت تھی جتنا ان کے خودساختہ 'مذہب و شریعت' کی رسّی مناسب سمجھتی۔

اس کے ساتھ ہی اللہ کا یہ ارشاد بھی سامنے آگیا کہ "نوعِ انسان ایک اُمّتِ واحدہ تھی (پھر انہوں نے آپس میں اختلافات پیدا کر لئے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے (۱۰/۱۹)۔ ان اختلافات کا مٹا لینا تنہا عقلِ انسانی کے لئے ممکن نہ تھا، کیونکہ ہر گروہ اور فرد کی عقل اس کے ذاتی مفاد کا تحفظ چاہتی ہے، دوسروں کا مفاد اس کے سامنے نہیں ہوتا) اس لئے اللہ نے انبیاءؑ کو وحی دے کر بھیجا۔ وہ انہیں اختلافی زندگی کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سناتے۔ ہر نبیؑ اپنے ساتھ ضابطۂ خداوندی (الکتاب) لاتا، تاکہ وہ "(اس کے مطابق) لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کرے" (۲/۲۱۵)۔ اللہ کے رسولؐ اس ضابطۂ قوانین (الکتاب) کے مطابق ان کے باہمی اختلافات دُور کر کے، انہیں ایک برادری بنا دیتے اور جاتے جاتے یہ کہہ جاتے کہ دیکھنا اس ضابطۂ قوانین کو، جس نے تمہیں اس طرح باہم گرملا دیا ہے، پسِ پُشت نہ ڈالنا، اس سے رُوگردانی نہ کرنا۔ وہ اللہ کا یہ ارشاد سُنا جاتے کہ "اگر تم نے رُوگردانی کی تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔" (۴۷/۳۸)

اپنی نکبت و زبوں حالی کی ساری داستان سمجھ میں آگئی۔ ہمارے ساتھ کیا یہ گیا ہے کہ ہمیں "زندگی دینے والے ضابطۂ حیات" (۸/۲۴) قرآن سے دُور کر دیا گیا ہے۔ اس کتابِ عظیم سے ہمارا تعلق منقطع کر دیا گیا ہے جس کے متعلق اُسے لانے والے رسولِ اعظمؐ نے اپنے آخری خطبہ 'حجۃ الوداع' میں (جو نوعِ انسانی کے لئے قیام کا منشور ہے) فرمایا تھا کہ "میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں، جس کا دامن اگر تم نے تھامے رکھا (یعنی اپنی حیاتِ ارضی میں اسے اپنا رہبر بنائے رکھا) تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب*"۔ اب ہم اپنی زندگی کے اختلافی امور میں فیصلے اس کتاب سے نہیں کراتے بلکہ مختلف اماموں کی فقہیں، مختلف مفسروں کی تفسیریں اور وہ روایات ہی ہماری زندگی میں فیصلہ کرنے کی آخری سند بن چکی ہیں جن کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ فرمانِ رسولؐ ہیں۔ حالانکہ کسی بات کے قولِ رسولؐ ہونے کی میزان اللہ کی کتاب کو ہونا چاہیئے تھا جیسا کہ قرآن سے ثابت شدہ سنّتِ رسولؐ کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے"۔ انسانی زندگی سے متعلق احکامِ ربّانی کی بجا آوری تو ایک طرف، ہم نے تقدیر، قسمت اور مقدروں کے چکّر میں

---

*تاریخِ اسلام، از ڈاکٹر حمید الدین مطبوعہ فیروز سنز لمٹیڈ، ایڈیشن چہارم طبع دوم جون ۷۰ء، ص ۶۹)۔

پڑھ کر اللہ کے طبعی قوانین کے مطابق تسخیرِ کائنات اور ذرائع رزق تک اپنی رسائی کو بھی ناممکن بنا لیا ہے حالانکہ اقوامِ مغرب، انہی قوانین کے مطابق تسخیرِ کائنات کر کے اپنی محنتوں کے ماحصل ہی سے اس قابل ہو سکی ہیں کہ ہمیں اپنا دست نگر بنا لیں۔

یاد رکھیئے! 'مومن' بننے سے پہلے 'مقامِ آدم' حاصل کرنا ضروری ہے (آدمی بننا ضروری ہے) اور مقامِ آدم یہ ہے کہ اللہ کی کائناتی قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں (۲/۳۴)۔ یعنی اللہ نے اپنی رحمت سے جو ذرائع رزق، زمین کے سینے میں، پہاڑوں کی چٹانوں میں اور سمندروں کی تہوں میں ہمارے لئے دفن کر رکھے ہیں، انہیں حاصل کیا جائے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم مقامِ آدمیت پر ہی فائز نہیں ہو سکتے جو اقوامِ مغرب نے یقیناً حاصل کر رکھا ہے۔ مقامِ مومن تو اس کے بعد آتا ہے۔ طبعی دنیا کی کوششوں کے ثمرات، مومن و کافر، مسلم و غیر مسلم، سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں اور اللہ نے کسی کے آگے بھی بند نہیں لگا رکھے۔ جو کوشش کرے گا، اللہ کا قانون اسے نتائج سے مالا مال کر دے گا۔ ملاحظہ فرمائیں ارشادِ ربانی:۔

"ہمارا قانون یہ ہے کہ جو کوئی، اس دنیا میں مفادِ عاجلہ چاہتا ہے ـــــ اور اس کے لئے طبعی قوانین کے مطابق کوشش کرتا ہے ـــــ ہم اسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، جسے ہم نے اپنے اختیارِ وارادہ سے ایسا بنایا ہے، مادّی مفاد دے دیتے ہیں۔ مستقبل کی زندگی میں، اس قوم کے لئے تباہی کا جہنم ہوتا ہے جس میں وہ بدحال اور دھتکاری ہوئی داخل ہوتی ہے۔

اس کے برعکس جو قوم (مفادِ عاجلہ کے ساتھ ساتھ ۲/۲۰۱) مستقبل کی خوشگواریاں بھی چاہتی ہے اور اس کے لئے ایسی کوشش کرتی ہے، جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے اور مستقل اقدار پر یقینِ کامل رکھتی ہے۔ تو یہ لوگ ہیں جن کی کوششیں، حال اور مستقبل، دونوں میں، بھرپور نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔

ہم اس طرح دونوں گروہوں کو (یعنی مفادِ عاجلہ طلب کرنے والوں اور مفادِ عاجلہ کے ساتھ مستقبل کی خوشگواریاں چاہنے والوں کو) اپنے طبعی قوانین کی رُو سے، ان کی کوششوں کے مطابق آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور تیرے نشوونما دینے والے کا عطا فرمودہ سامانِ رزق ان سب کے لئے یکساں طور پر کھلا رہتا ہے۔ اس کے راستے میں، کسی کے لئے بند نہیں لگائے گئے۔ (جو چیز طبعی قوانین کے مطابق حاصل ہوتی ہے، وہ ہر اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو اُس قانون کے مطابق، اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے۔ زندگی کی اس

دوڑیں، کافر و مومن، دونوں کے لئے یکساں میدان کھلا رہتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ کافر کو، اس کی کوشش کے باوجود، پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا جائے اور مومن کو، خواہ وہ کوشش ہی نہ کرے، آگے بڑھا دیا جائے۔" (۲۰/۴۲)

مقامِ آدم حاصل کرنے کے بعد، سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح حاصل کئے گئے ثمرات کو استعمال کیسے کیا جاتا ہے۔ ایک عبدِ مومن، اپنی محنتوں کے ماحصل کو، اقدارِ خداوندی کے ساحلوں میں رہتے ہوئے، بنی نوعِ انسان کی منفعت کے لئے استعمال کرتا ہے جبکہ کافر اپنی ذرائع کو اپنی ہی مفاد پرستیوں تک محدود کر کے دوسرے انسانوں کو ان کے ثمرات سے محروم کرتا ہے اور اس طرح ان کا استحصال کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم وہ مقام کس طرح حاصل کر سکتے ہیں جس پر فائز ہونے کے بعد، ہمیں اللہ کی ضمانت حاصل ہو سکے کہ کفار کبھی ہم پر غالب نہ آنے پائیں۔ اس کا جواب دو جہتوں سے ہوگا:

اوّلاً۔ ہمیں اپنے آپ کو تسخیرِ کائنات کے قابل بنانا ہوگا جس کے لئے سائنسی اور صنعتی ترقی لابنفک ہے۔ جب ہم مقامِ آدم حاصل کر لیں (یعنی اللہ کے اس ارشاد کی تصدیق مہیا کر لیں کہ "ہم نے زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، تمہارے تابع تسخیر کر دیا ہے (۱۳/۴۵)۔ تو پھر اس کے بعد ہم اپنی ہمعصر اقوام سے کندھا ملا کر چلنے کے قابل ہو سکیں گے۔

ثانیاً مقامِ آدم حاصل کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ، ہمیں مقامِ مومن حاصل کرنا ہوگا۔ یعنی اپنے ہاں ایسا معاشی و معاشرتی (SOCIO - ECONOMIC) نظام قائم کرنا ہوگا جس میں ہم تسخیرِ کائنات سے حاصل ہونے والے ثمرات کو ابتداءً اپنے ملک کی حدود میں بسنے والے انسانوں اور ازاں بعد تمام بنی نوعِ انسان کی منفعت کے لئے، اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کر سکیں۔ اس گوہرِ مقصود کی ابتدا اس دن سے ہوگی جس دن ہم یہ اعلان کریں گے کہ:

"آج سے ہماری اس مملکت میں، زندگی کا سارا کاروبار، قرآن کے مقرر کردہ، اقدار و اصولِ خداوندی کے مطابق انجام پائے گا۔"

یعنی بانیٔ پاکستان کے اس اعلان اور وعدہ کی تعمیل کرنا ہوگی کہ "اسلامی مملکت، درحقیقت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔"

یہ ہوگی ابتدائے کار، اس کے بعد ہمیں عملاً اس بات کا ثبوت بہم پہنچانا ہوگا کہ ہم فی الحقیقت اپنی زندگی کے تمام معاملات

میں خدا کی آخری کتاب، القرآن العظیم کو آخری سند قرار دیتے ہیں، نہ کہ کسی حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی یا جعفریہ فقہ کو۔

جس دن ہم نے یہ کر لیا، اللہ تعالیٰ کی مذکورہ ضمانت ہمیں حاصل ہو جائے گی اور ہم سب اس کی کائناتی قوتوں کے دوش پر سوار اپنا سفرِ حیات کامیابیوں اور کامرانیوں سے طے کرتے ہوئے، اللہ کے وعدہ کے مطابق، سب سے بلند و برتر ہونے کا مقام بھی حاصل کر سکیں گے اور اُسی کے ارشاد کے مطابق اقوامِ عالم کے اعمال کے نگران بھی بن سکیں گے (اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمّت بنایا ہے جو تمام افرادِ عالم سے یکساں فاصلے پر (EQUI-DISTANT) ہے تاکہ تم اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرو اور تمہارا رسولؐ تمہارے اعمال کا نگران ہو۔ ۲/۱۴۳)۔

ایسا ہو تو کیا خوب ہو!
یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است؟

وحی صرف قرآن میں ہے!

(بریگیڈیر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خاں کا خط بنام محترم جناب پروفیسر عبدالرحمٰن اشرفی صاحب)

میں قرآن حکیم کا ایک نہایت ہی ادنیٰ سا طالب علم ہوں اور اسی حیثیت سے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔

۳۰ جنوری ۹۲ء کو ٹی۔ وی پر "ضابطۂ حیات" کے سلسلے کا جو پروگرام پیش کیا تھا اُسے میں نے بغور دیکھا اور سُنا۔ اس میں جناب ڈاکٹر ملک غلام مرتضےٰ صاحب اور آپ نے، سورۃ الاعراف کی آیات ۱۹۹ تا ۲۰۵ پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب کی درخواست پر آپ نے خاص طور پر آیت (۷/۲۰۳) کے اس حصّے پر تبصرہ کیا جہاں کہا گیا ہے قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ" (اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ (میں کوئی بات اپنی طرف سے وضع نہیں کر سکتا) میں تو صرف اُس وحیٔ خداوندی کا اتباع کرتا ہوں، جو مجھے میرے ربّ کی طرف سے ملتی ہے)۔ تشریح کرتے ہوئے آپ نے بار بار فرمایا کہ "آیت (۷/۲۰۳) میں آئے ہوئے ان الفاظ سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وحیٔ خداوندی صرف قرآنِ حکیم ہی کے اندر ہے، ایسا نہیں ہے، وحیٔ خداوندی قرآنِ حکیم سے باہر بھی ہے"۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "وحیٔ خداوندی کی دو قسمیں ہیں ــــ ایک وحیٔ متلو اور دوسری وحیٔ غیر متلو۔ وحیٔ متلو تو قرآنِ حکیم کے اندر ہے (اسے ہم نمازمیں پڑھتے ہیں) اور "وحیٔ غیر متلو" رسولؐ اللہ کی احادیث ہیں"۔ "وحیٔ غیر متلو" کے بارے میں آپ نے مزید فرمایا کہ وحیٔ غیر متلو (یعنی احادیث) قرآنِ حکیم کے ساتھ قرآن کی مثل ہے۔ یعنی 'مثلہٗ' ہے۔ میں نے آپ کے ارشاد پر غور و فکر کیا اور اس کے نتیجہ میں چند سوالات ذہن میں آئے ہیں، جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ اِن پر غور کریں گے اور میری راہنمائی کے لئے اِن کے جوابات بھی عنایت فرمائیں گے۔

پہلا سوال تو یہی ہے کہ قرآنِ حکیم میں وحیٔ خداوندی کی اس تقسیم کا کوئی ذکر نہیں ہے جو آپ نے کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ رسولؐ اللہ کے زمانے میں بھی "وحیٔ متلو" اور "وحیٔ غیر متلو" کی اصطلاحات کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ آپ کے

پاس وحیٔ خداوندی کو دو قسموں میں تقسیم کرنے کی سند کیا ہے؟ سند یقینی ہونی چاہیئے، قیاسی نہیں۔ آپ نے جو دلائل دیئے تھے وہ سب قیاسی تھے۔

(۲) یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ دین کی ساری عمارت علم و یقین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ کے متعلق آپ کو یقینی طور پر علم نہ ہو کہ اس کی بابت اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہے تو آپ کے اعتقاد اور عمل کی ساری عمارت متزلزل رہے گی۔ اس لئے دین کا یقینی ہونا ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے اسی لئے لیا ہے۔ (۱۵/۹) کہ ہمیں یقینی طور پر علم رہے کہ قرآنِ حکیم کا ایک ایک حرف وہی ہے جسے اللہ نے نازل کیا تھا۔ رسولؐ اللہ نے اسی قرآنِ حکیم کو مرتب شکل میں امت کو دیا (۳۱-۱/۵۲، ۱۶-۱۵/۸۰) اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا۔ اس لئے دین میں صرف قرآنِ حکیم یقینی ہے اور سب ظنیات ہیں (۱۰/۳۶)۔ سوال اٹھتا ہے کہ اگر بقول آپ کے، "وحی غیر متلو" وحیٔ خداوندی ہے تو نبیٔ اکرمؐ نے اُسے مرتب کر کے، قرآنِ حکیم کے ساتھ، امت کو کیوں نہیں دیا؟ اور یہ بھی بتایئے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے "وحیٔ غیر متلو" کی حفاظت کا ذمہ بھی لے رکھا ہے؟ قرآنی حوالہ دیجئے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے متعلق فرمایا ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۝ (۴/۸۲)۔ (کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں کثیر اختلافات پاتے)۔ اللہ کے اس ارشاد کے مطابق اس کی وحی کی بنیادی اور پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف یا تضاد نہیں ہو سکتا۔ اب آیئے احادیث کی طرف جن کو آپ "وحیٔ غیر متلو" کا نام دیتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ احادیث کی مختلف کتابوں میں اور ایک ہی کتاب کی مختلف حدیثوں میں جو کسی ایک موضوع پر پائی جاتی ہیں، اختلافات ہیں۔ کتبِ احادیث میں وضعی اور ضعیف حدیثیں بھی ہیں اور صحیح اور غلط بھی۔ لہٰذا یہ اللہ کے مقرر فرمودہ معیار پر پورا نہ اُترنے کی بنا پر اللہ کی وحی نہیں ہو سکتی۔ اس واضح ارشادِ خداوندی کے بعد، آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ احادیث بھی وحیٔ خداوندی کی ایک "قسم" ہیں اور قرآن کی مثل ہیں؟

(۵) آپ کی نظر سے سورۃ الفرقان کی یہ آیت تو ضرور گزری ہو گی جس میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن رسولؐ اللہ اللہ کے حضور، اپنی اُمت/قوم کے بارے میں کہیں گے کہ وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ۝ (۲۵/۳۰)۔ (اور رسولؐ کہے گا کہ اے میرے ربّ! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو، اپنے خود ساختہ اعتقادات کی رسّیوں سے جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا)۔ آپ نے غور فرمایا کہ قیامت کے دن رسولؐ اللہ صرف

قرآنِ حکیم کے بارے میں "شکایت" کریں گے کہ ان کی قوم/امت نے اپنے آپ کو قرآن کے تابع رکھنے کی بجائے، اِسے اپنے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا (یعنی "مہجور" بنا دیا تھا)، "وحیٔ غیر متلو" (یعنی اپنی احادیث) کے بارے میں کوئی "شکایت" نہیں کریں گے۔ کیا اس قرآنی شہادت سے یہ بات ثابت نہیں ہو جاتی کہ عہدِ رسولؐ اللہ میں "وحیٔ غیر متلو" کا کوئی وجود نہیں تھا، یہ بعد میں، انسانوں کا وضع کردہ تصور ہے؟ قرآنِ حکیم کی رُو سے ہدایت (راہنمائی) صرف وحی ہے جو آخری بار نبیٔ اکرمؐ کو ملی اور اب قرآنِ حکیم کے اندر محفوظ ہے، اس سے باہر نہیں۔ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (۲/۱۲۰)۔ (راستہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جس کی طرف اللہ کی وحی راہ نمائی کرے (اور وہ وحی اب اپنی اصلی شکل میں قرآن کے اندر ہے)۔

(۵) یہی بات رسولؐ اللہ کی لسانِ مبارک سے آیت (۷/۲۰۳) میں کہلوائی گئی ہے کہ "ان لوگوں سے کہہ دو کہ (میں کوئی بات اپنی طرف سے وضع نہیں کر سکتا) میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے میرے رب کی طرف سے ملتی ہے"۔ اسی بات کو آیات (۱۰/۱۵، ۴۶/۹ و دیگر مقامات) میں دہرایا گیا ہے اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ کفر اور ایمان میں حدِ فاصل یہی وحیٔ خداوندی یعنی قرآنِ حکیم ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)۔ (جو کتاب اللہ کی حاکمیت قائم نہیں کرتے، انہیں کافر کہا جاتا ہے (۴۷، ۴۵، ۵/۴۴)۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے ارشاد فرمایا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔ (اے رسولؐ! حکومت اللہ کی کتاب (القرآن) کے مطابق قائم کرو)۔ ارشادِ خداوندی کے مطابق، رسولؐ اللہ نے مدینہ میں جو پہلی اسلامی حکومت قائم کی، اس کا دستور، اللہ کی کتاب، قرآن العظیم، ہی تھا۔ یہی ہمیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہی منشائے خداوندی ہے اور یہی سنتِ رسولؐ اللہ ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم، اللہ کے رسولؐ کی اس سنّت کو بھولے ہوئے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے تو خود کتاب اللہ کی پیروی کی اور دوسروں سے کرائی اور اس کی روشنی میں وہ اسلامی نظام قائم فرمایا جس کی لوحِ زمانہ پر یادگار اب تک منقوش ہے لیکن بعد میں، ہم مسلمانوں نے، اللہ کی اس وحی (قرآنِ حکیم)، جو رسولؐ اللہ پر نازل ہوئی تھی، کو پسِ پشت ڈال دیا اور انسانوں کی دی ہوئی تعلیم کے پیچھے چل پڑی۔ "وحیٔ غیر متلو" کی اصطلاح اِس بعد کے دَور کی ایجاد ہے۔ غالباً یہ عہدِ ملوکیت میں COIN کی گئی یعنی وجود میں آئی۔ آپ اس سے تو اتفاق کریں گے کہ اگر اس اصطلاح کا عہدِ رسولؐ اللہ اور خلفائے راشدینؓ کے دَور میں ذکر نہیں ملتا، تو یقیناً یہ بعد کی وضع کردہ ہے۔ بہرحال اِسے رسولؐ اللہ کے دَور سے تو ہرگز منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

(۶) حضور نبی اکرمؐ تو ہرگز ہرگز ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ کسی ایسی چیز کو جسے اللہ نے نازل نہیں کیا یہ کہہ کر دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کرتے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے کیونکہ آپؐ کے سامنے ہر وقت اللہ کا یہ کلیہ ہلا دینے والا انذار رہتا تھا کہ وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ (اگر یہ رسولؐ اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر اسے ہماری طرف منسوب کرتا تو ہم اسے دائیں ہاتھ کی محکم گرفت سے پکڑتے اور اس کی رگِ دل کاٹ ڈالتے یعنی اس کی سب اسکیموں کو بے جان کر دیتے)۔ کیا اس ارشادِ خداوندی کے بعد بھی آپ اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے ساتھ یہ بات منسوب کرتے ہیں کہ اُن کی طرف، قرآنِ حکیم کے علاوہ، ایک اور وحی بھی کی جاتی تھی جسے "وحیٔ غیر متلو" سے تعبیر کیا جاتا تھا؟

(۷) اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اس شہادت کے بعد جو آیت (۶/۱۹) میں آئی ہے! رسولؐ اللہ کی زبان سے کہلوایا گیا کہ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ..... (۶/۱۹) — (ان سے پوچھو کہ ان حقائق کی صداقت کے لئے (جنہیں میں بیان کرتا ہوں) کس کی شہادت سب سے بڑی ہو سکتی ہے، میرے اور تیرے درمیان خود اللہ کی شہادت موجود ہے کہ مجھ پر یہ قرآن وحی کیا جاتا ہے، تاکہ میں اس کے ذریعے، تمہیں اور انہیں بھی جن تک یہ قرآن بعد ازاں پہنچے، زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں .....)۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس آیت میں، قرآن کے علاوہ، کسی اور وحی کا ذکر نہیں ہے اور اس آیت (۶/۱۹) میں یہ بھی واضح طور پر کہا گیا ہے کہ آنے والی نسلوں کے لئے ہدایت کے لئے صرف یہی قرآنِ حکیم ہوگا۔ اللہ کی اس شہادت کے بعد آپ یہ کیسے دعوے کر سکتے ہیں کہ وحی کی ایک اور قسم بھی تھی، جو رسولؐ اللہ پر نازل ہوا کرتی تھی اور جسے "وحیٔ غیر متلو" کہا جاتا تھا؟ کیا آپ وضاحت فرمائیں گے؟

(۸) آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "وحیٔ غیر متلو" قرآنِ حکیم کے ساتھ، قرآن کی مثل ہے، یعنی مثلہٗ ہے، لیکن آیت (۱۷/۸۸) میں آیا ہے کہ قرآن کے "مثلہٗ" کوئی چیز نہ بنائی جا سکتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس آیت (۱۷/۸۸) میں اللہ تعالیٰ نے دنیا بھر کے انس و جن کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ "اگر وہ تمام کے تمام بھی اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں، تو ہم کہے دیتے ہیں کہ وہ اس کی (قرآن کی) مثل نہیں لا سکیں گے چاہے یہ ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کیوں نہ کر لیں" — قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (۱۷/۸۸)۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے پیشِ نظر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ "وحیٔ غیر متلو" (احادیث)

قرآنِ حکیم کے ساتھ، قرآن کی مثل ہے؟

(۹) اب آئیے اُن دلائل کی طرف جو آپ نے "وحیٔ غیر متلو" کو وحیٔ خداوندی ثابت کرنے کے لئے دیئے تھے اور جن کو میں نے "قیاسی" کہا ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ نماز پڑھنے کی ترکیب، رسول اللہ کو "وحیٔ غیر متلو" کے ذریعے بتائی گئی تھی کیونکہ قرآن اس بارے میں خاموش ہے۔ اس علمی بحث کو آگے بڑھانے کے لئے آپ سے درخواست ہے کہ پہلے یہ بتائیے کہ نماز پڑھنے کی کون سی ترکیب "وحیٔ غیر متلو" کے مطابق ہے۔ شیعہ حضرات والی، یا سنّیوں والی؟ اور سُنّیوں میں کس کی ترکیب "وحیٔ غیر متلو" کے مطابق ہے۔ وہابی والی یا اہلِ حدیث والی، بریلوی والی یا دیوبندی والی!؟

آپ نے دوسری دلیل یہ دی تھی کہ آیت (۶۶/۳) میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کی تہہ تک پہنچنے کے لئے رسول اللہ کو "وحیٔ غیر متلو" کے ذریعے بتایا گیا تھا کہ "پوشیدہ بات" عیاں ہوگئی ہے۔ مؤدبانہ گذارش ہے کہ آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ اس دوسری بیوی نے ازخود اس بات کا ذکر رسول اللہ سے کردیا ہو، یا رسول اللہ نے خود، اپنی عقل و بصیرت سے، اس دوسری بیوی کی بات چیت اور حرکات و سکنات سے یہ اندازہ کرلیا ہو کہ اسے، پہلی بیوی نے، وہ پوشیدہ بات بتادی ہے۔ بہرحال جس طریقے سے بھی رسول اللہ نے حقیقت کو بھانپ لیا، اُسے اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف منسوب کرلیا ہے۔ یہ قرآنِ حکیم کا اسلوبِ بیان ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالےٰ اپنی طرف ایسی باتیں بھی منسوب کرلیتا ہے جو باتیں انسان کو عام طور پر معلوم ہوجاتی ہیں یا جن کا علم وہ عام طریق کے مطابق حاصل کرسکتا ہے مثلاً آیت (۵/۴) میں دیکھئے، شکاری کتوں کو سدھانے کے طریق کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۔ حالانکہ یہ عام علمِ انسانی کی چیز ہے۔

محض ظن و قیاس کی بنیاد پر کسی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ قرآنی تعلیم [illegible] ہے (۱۰/۳۶)

[illegible] گذارش ہے کہ براہِ مہربانی بتائیے کہ احادیثِ رسول اللہ کی عظمت اور صحت ثابت کرنے [illegible] "وحیٔ متلو" اور "وحیٔ غیر متلو" جیسی اصطلاحات کا سہارا کیوں لیتے ہیں؟ رسول اللہ کا کوئی قول [illegible] نہ تو قرآنِ کریم کے خلاف جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ امتِ مسلمہ میں تفریق کا باعث بن سکتا ہے تو [illegible] تردّد کیوں؟ حضور نبیٔ اکرمؐ کی جو احادیث قرآنی تعلیم سے نہیں ٹکراتیں وہ صحیح ہیں۔ ہم اللہ [illegible] القرآن) کو ہر چیز کے پرکھنے کی کسوٹی کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ رسول اللہ نے تو دوٹوک [illegible] فرمادیا ہے کہ،

"میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس سے اگر تم وابستہ رہے، تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے، وہ چیز کتاب اللہ ہے۔" (مسلم، نسائی، ابوداؤد)

پھر یہ گمراہی کیوں؟

خط طویل ہوگیا ہے جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ بات ہی ایسی تھی جو چند الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی تھی۔ امید ہے آپ میری گزارشات پر غور کریں گے اور میری راہ نمائی فرمائیں گے۔

والسلام دعاگو

اعزاز الدین احمد خاں۔

طلوعِ اسلام: بریگیڈیر اعزاز الدین صاحب، کے مطابق اس خط کا تادمِ تحریر کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

فہرست معطیاں گفٹ سکیم

فدایانِ قرآن جنھوں نے مجلہ طلوعِ اسلام کی گفٹ سکیم کو کامیاب بنانے میں ادارہ کی مالی معاونت فرمائی۔ جزاك الله۔

۱۔ جناب بشیر احمد بٹالوی صاحب ـــــ ناروے	۲۔ جناب ڈاکٹر اکرم مرزا صاحب ـــــ پاکستان
۳۔ جناب یونس احمد سورا ٹھیا ـــــ امریکہ	۴۔ جناب محمد یونس راجہ صاحب ـــــ برمنگھم
۵۔ جناب ایم ایس فراز صاحب ناروے	۶۔ جناب عبدالقدوس صاحب ناروے
۷۔ جناب خواجہ محمد رفیق صاحب ـــــ انگلینڈ	۸۔ جناب کرم الٰہی صاحب ـــــ پاکستان
۹۔ بزمِ کویت ـــــ کویت	۱۰۔ بزمِ یارک شائر ـــــ انگلینڈ
۱۱۔ بزمِ لندن ـــــ انگلینڈ	۱۲۔ بزمِ اوسلو ـــــ ناروے
۱۳۔ بزمِ سعودی عرب ـــــ سعودی عرب	۱۴۔ بزمِ ڈنمارک ـــــ ڈنمارک
۱۵۔ بزمِ کینیڈا ـــــ کینیڈا	۱۶۔ بزمِ فیصل آباد ـــــ پاکستان

ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی لائبریریوں کو پرچہ بھجوانے کا عمل جاری ہے۔ دیگر احباب توجہ فرمائیں تو اس سکیم کو مزید وسعت دی جاسکتی ہے۔

ناظمِ ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزے کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آرہا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (معمول کے مطابق)[1] قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورہ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں:

(۱) یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَى الَّذِینَ مِن قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۲/۱۸۳)

"اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو"

(۲) أَیَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ ———— "یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں"

(۳) فَمَن کَانَ مِنکُم مَّرِیضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَیَّامٍ أُخَرَ ۚ

"پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے"

(۴) وَعَلَى الَّذِینَ یُطِیقُونَهُ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْکِینٍ ۖ

(۵) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِی أُنزِلَ فِیهِ الْقُرْآنُ .....

روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

(۷) فَمَن شَهِدَ مِنکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ۖ وَمَن کَانَ مَرِیضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَیَّامٍ أُخَرَ ۗ (۲/۱۸۳-۱۸۵)

---

[1] ان احکام کو ہم اس سے پہلے بھی کئی بار درج کر چکے ہیں لیکن ہم ان کے اعادہ کی ضرورت ہر سال سمجھتے ہیں۔ اسلئے انہیں پھر دہرایا جا رہا ہے۔

" لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔
البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو۔۔۔۔۔۔۔ تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلے۔"

(۸) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (۲/۱۸۷)

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیّز ہو جائے پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ (۲/۱۸۷)

اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ:۔

۱ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)

۲ روزے میں، اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

۳ روزے اس کیلئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کردے۔

۴ اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے۔ لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کردے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے! اوپر کی چاروں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ ـــــ وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں ـــــ کیا ہے۔
حالانکہ اس کا عام ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہو ـــــ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشأ

یہ نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ 'طاقت' کا ترجمہ اردو کے لفظ "طاقت" سے کر دیا۔ ان دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظر انداز کر گئے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم صـ۱۳۰۴ میں ہے۔

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کرسکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَتَلَنَا بِہٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اس طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صـ۱۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ

> طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار صـ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں۔

> اِطَاقَۃٌ دراصل مَکْنَتٌ اور قدرت کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّیْءَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو یعنی بدشواری اسے برداشت کرسکتا ہو۔ چنانچہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہوجانے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے... اسی بنا پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:۔

> طَاقَۃٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جاسکے اور وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں۔ جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف صـ۲۵۵ جلد۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے۔

> عربی زبان میں اَلْوُسْعَ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَۃٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیرِ نظر) کے

معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدّت اور مشقّت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں

ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے ..... (روح المعانی ص ۵۹ جلد ۲)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَۃ" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ ——— اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ——— کر دینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ ——— اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ... کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امّت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعیّن کر لے۔ چنانچہ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقّت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعیّن کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علّامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" ص ۲۶۸ - ۲۶۹ جلد ۲ میں ہے کہ:

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقّت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ ان کیلئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمّے کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمّے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ، ابن عباسؓ، قیس بن السّائب اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمّہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرّائے (حنیفہ) امام احمد اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عبّاس کی روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ام ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچّہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو اُن لوگوں میں سے ہے جو بمشقّت روزے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تیرے ذمّے فدیہ ہے قضا نہیں۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> اَلَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور ایسے لوگ ہیں جن کے اعذار کے دُور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے ضمرے میں شمار ہونگے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُرمشقّت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے

اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقّت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو ..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دُور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو۔ روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا۔ اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقّت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کیلئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار صـ۱۵۵ صـ۱۵۷ جلد ۲)

اِن تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتّب ہو جاتی ہے :

۱ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت
۲ حاملہ عورتیں۔
۳ دودھ پلانے والی عورتیں
۴ اپاہج اور معذور لوگ
۵ پرانی بیماریوں والے جن کے اچھّا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقّت رکھ سکیں
۶ ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (CONSTITUTIONAILY) کمزور پیدا ہوئے ہوں
۷ وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُرمشقّت کاموں میں ہوتی ہے مثلاً کانوں میں کام کرنے والے کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔
۸ وہ مجرم جن سے جیل میں مشقّت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقّت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآنِ کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸)

علّامہ غلام احمد پرویز کا درسِ قرآنِ کریم

درج ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
۱۔ ایبٹ آباد	۵۹۵ ، کے ایل کیہال	جمعتہ المبارک	۱۰ ، بجے صبح
۲۔ بوریوالہ	برمکان محمد اسلم صابر ۔ مرضی پورہ گلی ۵	ہر ماہ پہلا ۔ تیسرا جمعہ	۹ ، بجے صبح
۳۔ پشاور	برمکان محترم عبدالرزاق نزد چوک شہیداں قصہ خوانی بازار	بدھ / جمعہ	۴ ، بجے شام
۴۔ پشاور	برمکان ابن امین فقیر آباد	جمعتہ المبارک	۴ ، بجے شام
۵۔ پیر محل	مکان نمبر ۱۴۰ / ۱۳۹ ، مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	۹ ، بجے صبح
۶۔ پنج گسّی	برمطب حکیم احمد دین	جمعتہ المبارک	۳ ، بجے سہ پہر
۷۔ جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد ۔ جی ۔ ٹی ۔ روڈ	"	۶ ، بجے شام
۸۔ جلالپور جٹاں	یونائٹیڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	۱۰ ، بجے صبح
۹۔ چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	جُمعتہ المبارک	۲ ، بجے بعد نمازِ جمعہ
۱۰۔ چک ۲/۱۵ ای بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	"	۸ ، بجے صبح
۱۱۔ حیدر آباد	گولڈن سینٹری ۔ عثمان آباد	"	۵ ، بجے شام
۱۲۔ راولپنڈی	برمکان ملک فضل کریم ۴۰ ریکھا سنگھ سٹریٹ (رابطہ چوہدری نثار احمد ، فون ۷۲۴۷۵۲)	"	۳:۳۰ بجے شام
۱۳۔ رجانہ	برمکان چوہدری ایس ۔ ایم صادق ۔ مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	۱۰ ، بجے
۱۴۔ سرگودھا	۶۰ ، اے سول لائنز ۔ ریلوے روڈ	جمعتہ المبارک	۹ ، بجے صبح
۱۵۔ سید حسن	برمکان محترم سید محمد حسین	"	۳ ، بجے سہ پہر
۱۶۔ فیصل آباد	۲۳ ، سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل)	"	۳:۳۰ ، بجے سہ پہر

شہر	مقام	دن	وقت
	رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون ۴۲۸۵۵		
فیصل آباد	کارخانہ نٹ سازی گلی ۱۳ محلہ فیض آباد رابطہ فون: ۲۲۸۵۴ مرزا محمد صدیق	سوموار	۴ بجے سہ پہر
۱۷۔ کوئٹہ	۱۶۶/ڈی، جائنٹ روڈ	جمعۃ المبارک	۴ بجے شام
۱۸۔ کراچی	سنو وائٹ کمرشل کمپلیکس (فرسٹ فلور) شاہراہ فیصل (نزد بلوچ کالونی سگنل) فون: ۵۷۲۲۵۱ - ۵۴۷۳۲۹	//	۹:۳۰ بجے صبح
//	مکان ۱۲۰۶۔ گلی ۱۰ اے بی۔ ۳۶، شریف کالونی، لانڈھی۔	اتوار	۸ بجے شب
۱۹۔ گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
۲۰۔ گجرات	مرزا ہسپتال کچہری روڈ	جمعرات	۳ بجے سہ پہر
۲۱۔ لاہور	۲۵۔ بی گلبرگ ۲ (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	۹:۳۰ بجے صبح
۲۲۔ لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	//	بعد نماز مغرب
۲۳۔ ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	//	۱۰ بجے صبح
۲۴۔ اوسلو (ناروے)	TORG GATA 26-28 OSLO-1	ہر ماہ پہلا اتوار	۴ بجے شام
۲۵۔ برمنگھم (یوکے)	229 ALUM ROCK ROAD	اتوار	۳ بجے سہ پہر
۲۶۔ ٹورنٹو	716 THE WEST MALL ETOBICOCK ONT. (416)650-9187(416)626-6781	ہر ماہ پہلا اتوار	۱۱ بجے صبح
۲۷۔ ڈنمارک	GL KONGEVEJ 47, 3TH DK 1610 KBH V	ہر ماہ آخری ہفتہ	۲ بجے سہ پہر
۲۸۔ لندن	76 PARK RD ILFORD ESSEX TELE 01-553-1696	ہر ماہ پہلا اتوار	۲:۳۰ بجے سہ پہر

شہر	مقام	دن	وقت
۲۹۔ لاہور	۱۲۸۔ ایل ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن	ہر بدھ	بعد نمازِ عشاء
۳۰۔ جوہر آباد	برمکان حکیم فاروق شاہ، قاضی کالونی	ہر جمعہ	بعد نمازِ جمعہ
۳۱۔ ماموں کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر پک ۵۰۹ گ ب	ہر جمعہ	بعد نمازِ جمعہ
۳۲۔ ڈی جی خان	مدینہ ٹائپنگ کالج بلاک ۲، کچہری روڈ	جمعہ	۳ بجے سہ پہر
۳۳۔ کویت	برمکان عبید الرحمٰن آرائیں صاحب فون ۵۳۱۶۲۷۳	جمعہ	۵ بجے شام

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں...!

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی مخالفت کرنے والوں کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل رہی ہے جو پرویز صاحب کو براہِ راست پڑھنے پر مطمئن تو ہو جاتے ہیں لیکن اپنے اندر اعترافِ حقیقت کی جرأت نہیں پاتے۔ ان حالات میں ہم ماہنامہ المذاہب لاہور کے ایڈیٹر جناب اسلم رانا صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں جنہوں نے پرویز صاحبؒ کے متعلق اپنی غلط فہمی کا نہ صرف برملا اعتراف کیا بلکہ اسے اپنے پرچے میں نمایاں طور پر شائع کیا۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ المذاہب بابت فروری ۱۹۹۲ء کے صفحہ ۲۳ پر شائع شدہ ان کے بیان کا مکمل متن:-

"ہم نے اپنے شمارہ بابت جولائی ۸۹ء میں پرویزؒ صاحب سے متعلق یہ لکھا تھا" دلِ ناداں عجیب شے ہے۔ اس میں بہت سارے خانے ہیں بنداب بھی پرویزؒ صاحب کو محفل لوٹ سکنے والے، چرب زبان مقرر، لفاظی، تصویر بنانے، قارئین کو الفاظ کے چکر میں اُلجھا لینے کی صفات سے متصف مصنف، مشاق اہلِ قلم، بلند و بالا خیالات سے معمور اور جوڑ توڑ کی ماہر ہستی کی حیثیت سے عزت کرتا ہے۔"

اس کے بعد ہمیں ان کی مزید کتب پڑھنے اور درس سننے کا اتفاق ہوا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمارا پہلا خیال درست نہیں تھا۔ پرویز صاحب کا قرآنِ کریم کی ترجمانی میں اپنا ایک مقام ہے اور ہم اسے احترام و قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

حقائق و عبر

۱۔ گھر کا بھیدی

"حقوقِ انسانی کی بدترین خلاف ورزی جنگ کا آغاز کرنا ہے۔ پچھلے دس سالوں میں ہر جگہ جنگ کا آغاز امریکہ نے کیا۔ لبنان پر اسرائیل کو حملہ کرنے کی خاموش اجازت ہم نے دی۔ بیروت کے گردونواح کے دیہات پر بمباری ہم نے کی۔ غرناطہ کے خلاف جنگ ہم نے شروع کی۔ پانامہ پر حملہ ہم نے کیا۔ عراق پر حملہ کے سرکردہ ہم ہی تھے اور ہم نے مسئلہ کو حل کرنے کی پُرامن کوشش نہیں کی۔"

یہ الفاظ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر کے ہیں جو انہوں نے بوسٹن میں حقوقِ انسانی کے ایوارڈ تقسیم کرتے وقت کہے۔ (بحوالہ ماہنامہ محقق ــ جنوری ۱۹۹۲ء)

۲۔ بلا تبصرہ

(ملفوظات حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی)

"عورتوں کو اخبار بینی سے بچنا چاہیئے۔

عورتوں کی اخبار بینی کی مذمت میں فرمایا کہ عورت کی تو صفت ہے کہ وہ ملکی احوال سے بے خبر ہو۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ۔ (یعنی جو لوگ تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو پاک دامن ہیں اور ایسی باتیں کرنے سے بے خبر ہیں)۔ جغرافیہ و تاریخ کی تعلیم عورتوں کو دینے کا ضرر یہی ہے کہ ان کو مفرور ہونے میں سہولت ہو گی، کیونکہ پتہ ہو گا کہ جنکشن کہاں کہاں ہیں۔" (خیر الافادات ص۶۳) (بحوالہ ماہنامہ البلاغ۔ فروری ص۵۲)

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت

علامہ غلام احمد پرویزؒ

خدا کے قانون اور انسانوں کے قانون میں فرق

۲

تم نے ایسا بھی سُنا ہوگا کہ موٹروں کی ٹکر ہوئی اور جس موٹر والے کا قصور تھا وہ موٹر بھگا کر لے گیا اور پکڑا نہیں گیا اس لئے وہ سزا سے بچ گیا۔

اور اگر وہ پکڑا جاتا ہے تو بعض اوقات پولیس کو رشوت دے کر یا افسر کے پاس سفارش پہنچا کر، بھی سزا سے بچ جاتا ہے۔

جُرم کر کے بھاگ جانا یا رشوت اور سفارش کے ذریعے اپنے حق میں فیصلہ لے لینا، بہت بُری بات ہے۔ لیکن اس وقت جس مقصد کے لئے ہم نے یہ بات بیان کی ہے وہ اور ہے۔ اسے غور سے سُنو۔

موٹر والی مثال میں بعض اوقات مُجرم، قانون کی خلاف ورزی کرنے کے باوجود سزا سے بچ جاتا ہے۔ لیکن اب تم ذرا دوسری مثال پر غور کرو۔

جس لڑکے نے آگ میں ہاتھ ڈالا تھا، وہ اگر کسی بند کمرے میں ایسا کرتا جہاں اُسے دیکھنے والا کوئی نہ ہوتا تو بھی اس کا ہاتھ اسی طرح جل جاتا اور اُسے اسی طرح درد ہوتا۔ وہ جہاں جی چاہے بھاگ کر چلا جاتا، درد اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ وہ اگر چاہتا کہ کسی کو رشوت دے کر یا سفارش ڈلوا کر، اس تکلیف سے بچ جائے تو ایسا کبھی نہ ہو سکتا۔ اُسے اس کے

کیئے کی سزا مل کر رہتی ہے۔

انسانوں کے بنائے ہوئے قانون اور خُدا کے بنائے ہوئے قانون میں یہ بنیادی فرق ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کرنے والا بعض وقت سزا سے بچ جاتا ہے لیکن خدا کے بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کرنے والا کسی صورت میں بھی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جُرم کرنے والا سزا سے بچ جاتا ہے اور کسی بیگناہ کو سزا مل جاتی ہے۔ لیکن خدا کے قانون میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آگ میں اُنگلی مَیں ڈالوں اور درد کسی اور کو ہونے لگ جائے۔ جو آگ میں اُنگلی ڈالے گا درد اسی کو ہوگا۔ جو ایسا نہیں کرے گا اسے درد نہیں ہو گا۔

انسانوں کے بنائے ہوئے قانون اور خُدا کے قانون میں یہ دوسرا بنیادی فرق ہے۔ خُدا کے قانون میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ جُرم کرنے والے کو سزا نہ ملے اور بےگناہ مفت میں پکڑا جائے اور سزا پائے۔

(اس مضمون کا انگریزی ترجمہ صفحہ ۶۲ پر دیکھیں)

country, to any particular nation but useful for the whole of mankind.

Dr. Sayed Abdul Wadud,
50-Usman Block
New Garden Town,
Lahore.

THE DIFFERENCE BETWEEN GOD-MADE LAWS AND MAN-MADE LAWS.

You might have seen, when two motor vehicles collide against each other, the driver at fault tries to run away in order to escape punishment. If he is arrested by police he tries to offer bribe and bring some "Sifarish" for the police officer in order to escape punishment. It is too bad to try to escape punishment after committing a crime, by means of bribery or "Sifarish" and to get the case decided in your favour. Why? In order to understand this point, pay attention to the case of the boy who had burnt his hand. Had he put his hand into the fire, while sitting in a closed room, with no body to watch him, even then he could not have saved himself from pain and punish-ment. No bribery or "Sifarish" could help him. That is the fundamental difference between the nonobservance of God-made laws and the man-made laws. The man who disobeys man-made laws, sometimes gets a chance to escape but there is not the slightest chance to escape after disobedience of God-made laws.

Sometimes it so happens that one who commits a crime escapes and somebody else gets punished in his place. But this can not occur when a God-made law is disobey. It is impossible that one man puts his finger inside the fire but another one feels pain instead of him. This is the second basic difference between a God-made law and a man-made law. It is also impossible in the case of God-made laws that one person commits a crime and another gets punished instead.

bound to fall in to disgrace and destruction. The Quran says:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ
مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا
وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٥٨﴾

(28:58)

"And how many populations We destroyed, which exulted in their life (of ease and plenty). Now those habitations of theirs, after them, are deserted—all but (miserable) few and We are their heirs."

Again it is said:

فَكَاَيِّنْ
مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا
وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿٤٥﴾

(22:45)

"How many populations have We destroyed, which were given to wrong doing. Their dwellings fell into utter ruins. And many wells are lying idle and also the castles lofty and well built."

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٦٩﴾

(27:69)

"Say Go through the land and see what has been the end of those guilty nations."

The holy Quran has thus made it abundantly clear that the basis of downful and destruction of nations is their wrong social systems and at the same time has presented before us the basic principal of survival:

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۚ

(13:17)

"For that which is for the good of mankind remains on the earth."

It means that that concept of life, that principle and that social order survives on the earth which is beneficial to the whole of mankind; and that its usefulness is not limited to any particular person, to any particular group of people, to any particular party, to any particular

the leaders design. In fact the power of the leaders lie in their followers.

Just as the leaders and their followers who belong to one particular nation, together become the pieces of the chain of ruination, similarly one particular nation will reach destruction by blindly following another wrongful nation. The holy Quran tells us that the nations who reach destruction accuse one another for their misleading role. Thus it is said:

حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا

هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ

قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ (7:38)

"Until they follow each other, all in to fire. Says the last about the first; "Our Rabb! It is these who misled us: so give them a double penalty in the fire." He will say: Doubled for all: but you do not understand this."

It means that if a particular nation follows another perverse nation, both shall get a double penalty. Thus the holy Quran has made it abundantly clear that blind following of one nation by an other leads both of them to the pit of fire. The Quran repeatedly impresses upon man to use intellect and follow the path laid down by the divine guidance. That shall lead you to a path full of glory, magnificence and delight. Not to speak of the wrong path, the Quran ordains to use intellect and think before taking to the right path even: Thus it is said:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا

صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ (25:72)

"Those who when they are admonished with the signs of their Rabb, droop not down at them, as if they were deaf or blind."

A nation might gain power and wealth by following a wrong social order but that is only a temporary phase. Ultimately such a nation is

was difficult for simple minded people to get out of your tangle. Thus you compelled us indirectly, to leave the path of divine guidance and follow you."

In the words of the holy Quran:

قَالَ
الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ
الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُمْ بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الَّذِينَ
اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا
أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا

(34:32-33)

"The arrogant ones will say to those who had been despised, "Was it we who kept you back from guidance after it reached you? Nay, rather it was you who transgrssed." Those who had been despised will say to the arrogant ones, "Nay it was a plot (of yours) by day and by night. Behold! You (constantly) ordered us to be ungrateful to Allah and to attribute equals to Him."

At yet another place it is said that the followers shall request Allah as fallows:

وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ﴿٦٧﴾
رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ﴿٦٨﴾

(33:67-68)

"And they would say: "Our Rabb! we obeyed our chiefs and our great ones and they misled us as to the (right) path. Our Rabb! Give them double penalty and curse them with a very great curse."

The above description has made it clear that both the leaders and their followers are equally guilty. Leaders are guilty because they use their followers as tools to achieve their nefarious designs; and the followers are guilty because they like a herd of sheeps get entangled in

"Thus have We placed leaders in every town, its wicked men, to plot (and burrow) therein."

وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿١١٦﴾

(11:116)

"But the wrong doers pursued their enjoyment of the good things of life by parasitism and persisted in their life of sin."

These greedy and selfish exploiters become the leaders of their nation and lead their carvan to a market where there is no buyer of this rotten commodity.

The Quran says:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا

وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾

(14:28-29)

"Have you not turned your vision to those who have changed the favour of Allah into blasphemy and caused their people to descend to the house of perdition. — in to hell; they will burn therein, an evil place to stay in."

But it also must be kept in mind that whereas the Quran accuses the leaders, it does not exempt the common man. It equally declares them guilty. Thus it is said; Why should the followers of such leaders, follow them like a herd of sheeps? It is their responsibility to distinguish between right and wrong and follow the path of peace and safety. The Quran has described a beautiful conversation between these people and their wrongful leaders, after both of them shall reach the hell. The people shall speak to the leaders: "you have ruined us. Without you we would have followed the right path." The leaders shall say, "It was your own fault. The right path was before you. No body could prevent you to follow that path. You yourselves are the sinners and accuse us for nothing. "The people shall return their argument by saying; "So far it is true that you did not ask us verbally to commit offences but day and night you kept yourselves so busy in bringing about plots and conspiracies that it

question is important and the Quran answers as follows:-

ذٰلِكَ
بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ
حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (8:53)

"Because Allah will never change the grace which He has bestowed on a people, until they change what is in their own self. And verily Allah is He Whose power of hearing and knowledge are boundless."

In this small verse, the Quran has enclosed the philosophy of the rise and fall of nations — that philosophy which can not be explained otherwise in huge big volumes. The Quran says that the outer world is the true image of the man's inner self . As long as there is no change in its inner self, there can be no change in its outer world either. Also that the change in the outer world is the prototype of the change in the inner world. This change in the inner world is termed by the holy Quran as ایمان 'belief'. It means that the correct angle of vision, right objective and belief in the revealed permanent values, make the internal forces of man, get concentrated on one point; and its results are so wonderful and so unpredicted that one can not imagine otherwise.

Bertrand Russel says: "Our present difficulty is that we have conquered the forces of nature to a considerable extent but have not been able to conquer the forces which lie within ourselves. Self-control has always been the foremost teaching of every teacher of ethics but in early ages a clear concept of it did not exist. However self-control means how to utilise the external forces in subservience to the correct values."

The Quran also tells us that corruption amongst nation, starts in the upper ranks and from there it spreads and affects the lower ranks. The former indulge in a life of ease, selfishness and luxury and invent plots to keep their hold firm on their wrong system. They are parasites on the lower ranks thus it is said:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكٰبِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا

(6:124)

"Remember also the Âad and Thamûd people: clearly will appear to you from the (traces) of their buildings (their fate): the evil one made their deeds alluring to them and kept them back from the (right) path , though they were gifted with intelligence and skill.

At yet another place it is said: وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ

إِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ

فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ

إِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (46:26)

And We had firmly established them in a (prosperity and) power which We have not given to you, and We had endowed them with (faculties of) hearing, seeing and intellect: but of no profit to them were their (facilities of) hearing, sight and mind, when they went on rejecting the signs of Allah and they were (completely) encircled by that which they used to mock at."

In means that a nation who possess extremes of wealth, power, means of living as well as the knowledge of the present day world but who is so much indulged in selfish gains that it keeps its eyes and ears closed and is unable to realize the end of the way it is proceeding, even if the divine social system is presented to them, these people object to it on account of their selfishness."

Thus according to the holy Quran if a social order is based on self-made laws and the divine laws are rejected by the people who are wise and far advanced in worldly knowledge, the ultimate result is failure and destruction.

The Quran says that in the dark night of life, the dawn breaks through, only when the sun of permanent values makes its appearance, the values, which today are present in the pages of the holy Quran only.

The question arises at this juncture what is that thing which is missing, when the nations, possessing wealth, power, intellect and knowledge, are doomed to failure and ultimately meet destruction? The

the commoners make together separate parties and these parties strike against each other. All these conflicts result into the downfall of that nation.

But what the Quran wants to impress upon is that a nation even if it possesses power, wealth, superiority in numbers and domination, it shall not escape destruction, if their social order is based on wrong lines. Thus it is said:

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ
فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا أَشَدَّ
مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا
وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن
كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٩﴾ (30:9)

"Do they not travel through the earth and see what was the end of those before them? They were superior to them in strength; they tilled the soil and populated it in greater number than these have done; there came to them their apostles with clear (Signs) (which they rejected to their own destruction); it was not Allah Who wronged them but they wronged their own selves."

At yet another place the Quran says that these people, who rejected Allah's messages were not savage or uncivilised; They were, on the other hand, wise and intelligent, yet they did not understand that their social system stood on wrong basis. Thus it is said about Âad and Thamûd people:

وَعَادًا وَثَمُودَا وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَاكِنِهِمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ
الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ﴿٣٨﴾ (29:38)

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ﴿٣٨﴾ (47:38)

"Behold you are those invited to spend (of your substance in the way of Allah. But among you are some that are niggardly. But any who are niggardly are so at the expense of their own self but Allah is free of all wants. And it is you who are needy. If you turn back (from His path) He will substitute in your stead another people, then they would not be like you."

At yet another place the Quran says that the nation that shall take your place shall be better than yourself (70:40).

CONFLICT BETWEEN MATERIAL FORCES:-

Conflict between material forces. The mutual conflict between nations may only be on material level which means that none of these nations has got a right type of social order. About them the Quran says:

وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿١٣٠﴾

(6:130)

"Thus We do make the wrong doers turn against each other, because of what they earn."

On the other hand, the conflict may be between different parties within a nation. About them the Quran says.

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ﴿٦٥﴾ (6:65)

Say: "He has power to send calamities on you from above and from below or to cover you with confusion in party strife, giving you a taste of mutual vengeance, each from the other."

It means that sometimes a despotic ruler gains power and the common man gets crushed under his rule. As a reaction the people rise in revolt against him. And sometimes it so happens that the leaders and

But the Quran loudly proclaims:

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝
وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ (89:17-18)

"Nay but you honour not those who are left alone in the society. Nor you encourage one another to feed those whose life-earning business came to a stand still."

On the centrary what you do is:

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

(89:19-20)

"You devour (their) inheritance (which they get from their forefathers) with greed. And you love wealth — So much so that you try to accumulate all that belongs to others". You established a society which could lead to nothing but humiliation:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ۝

(11:117)

"Nor your Rabb would be the One to destroy communities for a single wrong doing, if its members were likely to mend."

Now let us see what is meant by the destruction of a nation:

It does not mean that every individual of a wrong-doer nation is killed. But according to the holy Quran the destruction of a nation means that she loses power, influence and authority and becomes replaced by another nation. That is called the law of "Succession and Substitution of nations"

The Quran says: هَا أَنتُمْ

هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ ۖ وَ
مَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ۚ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ ۚ

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝

(13:38)

"Each period is according to law."

From the above it is clear that the life or death of a nation does not occur by chance or by means of blind forces. It occurs according to law:

وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۚ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ

وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (8:42)

"But Allah has decided to execute a plan, that had to be carried out, so that he who perishes must have an obvious cause of his death and he who survives, must have an obvious cause of his survival. And verily Allah is All-Hearing and All-Knowing.

Thus neither the life of a nation is bestowed upon it as a gift, nor its death occurs by brutal force:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (29:40)

"It was not Allah who injured (or oppressed) them: they injured (and oppressed) their ownselves."

At yet another place it is said:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا

(4:147)

"What can Allah gain by your punishment, if you are grateful and you believe? Nay, it is Allah that recognizes (all good) and knows (all things)."

(89:16)

Any nation might says that:- رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝

"My Rabb has humiliated me (without a cause)."

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ (101:6-9)

"Then he whose balance (of good deeds) will be (found) heavy, will be in a life of good pleasure and satisfaction But he whose balance (of good deeds) will be (found) light will have his home in a (bottomless) pit."

It so happens because the constructive deeds go on neutraling the effects of bad deeds, side by side:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (11:114)

"For, those things that are good remove those things that are evil."

Thus if the side of destructive deeds in the balance goes on getting heavy, that nation gradually proceeds towards destruction, so much so that its people are unable to realise even, that they are drifting towards downfall. In the words of the Quran:

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ (68:44)

"By degrees shall We punish them from directions they perceive not."

If a nation mends its ways during the course of its wrong action, it can save itself from falling in to the pit of fire but when it reaches the final stage then there is no chance of return:

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ (21:95)

"But there is a ban on any population which We have destroyed; that they shall not return."

The time allowed for the return is determined according to the nature and severity of wrong deeds. The terminal stage of this phase of allowance is termed . اجل . by the holy Quran:

lead a difficult life. That experience is true indeed, but you cannot observe the effects of any concept of life or a system of life and the fate of nations that organise that system, in a short span of time. It might require centuries to do it. That is why the Quran has said that a day of universal laws comprises centuries. The people question why this destruction does not come soon? The answer is that the law of requital stands firm but it takes time to get the results of actions performed:

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ
وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (22:47)

"Yet they ask thee to hasten the punishment. But Allah will not fail in His promise. Verily a day in the sight of thy Rabb is like a thousand years of your reckoning."

The measures to ascertain the length of life and death of nation are different from those for the life of individuals.. Thus if the result of the wrongful deeds of a nation, does not appear earlier, it should not give an impression that its deeds are not being counted. In the universal balance even a minutest deed is being weighed:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (99:6-7)

"Then shall anyone, who has done an atoms weight of good, see it. And anyone who has done an atoms weight of evil, shall see it."

But as in the case of individuals, the laws for the health and ill-health or life and death of nations is that as long as the balance on the side of good things is heavy, the nation survives and progresses; but when the balance on the side of wrong action gets heavy, the downfall of the nation begins:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝

destruction.

Next question arise, after all what is the purpose behind the domination of truth over falsehood, and what is the force behind it? The Quran says that the machinery of this universe has got a purpose behind it. It is not a thing in vain:

(44:38) وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ

"We created not the heavens and the earth, and all that is between them, merely an idle sport."

(44:39) مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

"We created them not except for just ends, but most of them do not understand."

They think that the universe has automatically come into existence and that all its activities are without any purpose. This is a wrong concept. In fact all the activities of the universe are meant to produce specific results:

(53:31) لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى

"So that He rewards those who do evil, according to their deeds, And He rewards those who do good with what is best."

Because the creation of the universe has got a purpose behind it, any concept, any action and any system of life which is consistent with the truth and the permanent values, shall keep alive and undergo development: And anything that goes against it and is detrimental to the construction and development of humanity, shall perish.

The question may be raised at this point that it is an every day experience that wrong doers prosper and people who are honest and just

this theory and said that the conflict is not between ideas but between economic systems. An economic system originates, grows and when it reaches its maturity, another economic system takes its place. When Hegel was asked, "What is the force acting behind this conflict"? He said, "it is a historical necessity". According to this theory the entire universe is without any purpose and without and any objective: an idea is neither good nor bad; nor an idea or a social order has got an inherent capacity of development and permanent stay and neither there is any force which controls the machinery of this universe for a definite purpose. Some blind forces which are working mechanically, are the cause of mutual conflict and the helpless man is being crushed between these forces.

QURANIC PHILOSOPHY OF HISTORICAL EVENTS:

But the Quran presents an entirely different philosophy of history. The Quran says that a Constant conflict is going on in the universe between .حقّ...truth and .باطل.falsehood. 'Haqq' is stable and immutable; its result is construction and evolution. Opposite to it 'Batil' is ever changing and unstable. It results in to distegration and decline. In this struggle between truth and falsehood, the truth is bound to succeed and overpower in the end; because to gain power is inherent in its very nature:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ

"Nay We hurl the truth against falsehood."
What is the result?

The result is: فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ

"And it knocks out its brain and behold falsehood does perish."

(21:18) وَ لَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ

And woe be to you, for any thing that you ascribe against this concept. The falsehood results in nothing but

those who earn their livelihood by hard labour, are called ....مترفین..... This is a specific Quranic term. Mutrafeen' always apposed the social order based on Divine laws. Verse (21:13) says that they shall be warned to return to their lofty palaces and give an account of their hoarded wealth."

قَالُوا يٰوَيْلَنَآ إِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

(21:14)

"They said: Ah! Woe to us. We were indeed wrong doers." The wealth we possessed was gained by ....ظلم..... or unfair means.

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۝ (21:15)

"And that cry of theirs ceased not, till We made them as a field that is mown, as ashes silent and quenched."

In the verse (21:12) it is said, "When they felt Our punishment." It means that the destructive effects of wrongful social orders start building up from the very beginning but they are not being felt at this early stage. They grow silently until they appear in a palpable from.

We have also seen that the laws according to which the life and death of nations is decided are termed by the Quran as ....سُنَّةَ اللّٰهِ...., which means that the law of requital which is present from the very beginning is immutable:

لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝

(35:43)

"You can never find a change in the working of the Divine laws."

In modern times Hegel and Marx presented a theory based on the philosophy of history. Hegel said: "An idea originates, grows, and reaches its pinnacle, and then declines. The course of its decline is the origin of an apposite idea from within. The new idea meets the same fate and these events occur successively. The whole history is a story of the struggle between the conflicting ideas." Marx made an amendment in

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي
قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ﴿٤٠:٨٥﴾

(40:85)

"But their professing the belief when they (actually) saw Our punishment was not going to profit them. (Such has been) Allahs way of dealing with His servants (from the most ancient times) and even thus did the rejecters of Allah perish (utterly)."

At yet another place the holy Quran says:

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً
وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ﴿٢١:١١﴾

(21:11)

"How many were the populations We utterly destroyed because of their inequities, setting up in their places other peoples."

فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ﴿٢١:١٢﴾

(21:12)

"Yet when they felt Our punishment coming they (tried to) flee from it."

And We said:

لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ
وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ ﴿٢١:١٣﴾

(21:13)

"Do not run away but return to the good things of your life (which you got by parasitism) and to your homes in order that you may be called into account."

The word ....أُتْرِفْتُمْ....in the above said verse is significant. The word with root ت..ر..ف..means good or pleasant things in life, a life of luxury and extravagance. People who live easy life, being parasites on

clear and (illustrations) from the history of people who passed away, before you, and an admonition for those who believe."

The Quran Warns the non believers as follows:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ
كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَىٰ
عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿40:82﴾

"Do they not travel through the earth and see what was the end of those before them? They were more numerous than these and superior in strength and in the traces (they have left) in the land: Yet all that they accomplished was of no profit to them."

First, Allah sent towards them His messengers in order to warn them of their misdeeds which were leading them to destruction, they rejected them and told them that they were well satisfied with their own way but at last the wrath of Allah which they scoffed at, encircled them:

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ
وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿40:83﴾

"For when their apostles came to them with clear signs, they exulted in such knowledge (and skill) as they had, but that very (wrath) which they scoffed at, encircled them (leaving no way of escape)."

What happened next?

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَ
كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ﴿40:84﴾

"But when they saw Our punishment they said: 'We believe in Allah,- the One Allah-and we reject the partners we used to associate with Him."

RISE AND FALL OF NATIONS DEPENDS ON THEIR SOCIAL SYSTEMS

The laws revealed to the messenger of Allah for the guidance of humanity are immutable. They comprise two different categories: those for the individuals and those for the nations. The laws for individuals are related to physical life, as well as for the development of human personality. As far as the nations are concerned, although they comprise groups of individuals yet their psychology has got its own individuality and peculiarity. The Holy Quran says that nations who lead their lives in consistence with the revealed laws i.e., organize their social order based on such laws, meet success, glory and an exalted position: And those who act against these laws meet failure and ultimately destruction. This is known as "the collective law of requital," which is as immutable as the law of requital for individuals. According to the Holy Quran, history is a record of the collective laws of re-requital. It tells us that so and so a nation, when it organized its social order, according to so and so a concept of life, the results produced were specifically peculiar to that concept. It was the Holy Quran that gave first of all the concept of the Science of History. The Quran attaches such a great importance to it that it relates the history of bygone nations, in order to prove the truth of the Quranic fundamental principles. Thus when it is said that so and so a nation shall meet destruction if it acts in a way opposite to that prescribed by the revealed laws, you can prove the truth of this assertion by going through the history of the past nations. This way of putting to test the Quranic truths is open to all. That is why the Quran lays great stress on the study of history and says that it shall benefit you in two different ways. Firstly that the evidences which the Quran claims, shall come to the surface and secondly that you shall be able to judge yourself, if your own actions are in the right direction or not. Thus it is said:

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

(24:34)

"We have already sent down to you signs, making things